ماہنامہ

ترجمان القرآن

جنوری ۱۹۹۹

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۶　　　جنوری ۱۹۹۹، رمضان ۱۴۱۹　　　عدد ۱

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۴۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۴۵۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

فریب نظر، چشم دید

روسی مظالم سے تنگ آکر بخارا اور ترکستان کے مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں ہجرت کر رہے ہیں۔ اب تک تقریباً پچاس لاکھ مہاجرین اپنی متاع ایمان کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک قافلہ ۱۰ ار اپریل ۱۹۳۷ سے ہندوستان بھی آیا ہوا ہے۔ دہلی میں ان مہاجرین نے اپنی تنظیم کے لیے "انجمن اتحادیہ" کی بنا ڈالی ہے۔ یہ ماہنامہ [ترجمان] اسی انجمن کا آرگن ہے، جو چند ماہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ بعض مفید علمی و اصلاحی مضامین کے علاوہ جو چیز خاص طور سے قابل توجہ ہے وہ اشتراکی روس کی ہلاکت آفرینیوں اور فرزندان توحید کی خانہ بربادیوں کا وہ دل دوز مرقع ہے جسے یہ ستم زدہ مہاجرین اپنے قلم سے کھینچ رہے ہیں۔ دردمند مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس رسالے کی صدا زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچائیں تاکہ ان فریب خوردوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے جو اشتراکی نظام کو دنیا کے لیے رحمت سمجھ رہے ہیں اور جنھیں سویٹ روس کا جہنم زار، جنت نشان نظر آرہا ہے۔ اس وقت انھیں معلوم ہو گا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے وہ جس نظام کی عدل پروری اور انسانیت نوازی کا دن رات قصیدہ پڑھا کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور جنھوں نے عملاً اسے دیکھا، بھگتا اور چکھا ہے وہ اس کا کیا حال بیان کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ مسلمانان ہند اپنے مظلوم بھائیوں کے تجربے اور مشاہدے سے فائدہ اٹھائیں گے اور اشتراکی زہر کو اسلامی تریاق سمجھنے کی خطرناک غلطی نہ کریں گے۔ اس رسالے میں روسی اور اشتراکی نظام کے متعلق جو کچھ شائع ہو رہا ہے نہ تو وہ کوئی پروپیگنڈا ہے اور نہ اختلاف نظریات کا اثر ہے بلکہ یہ لوگ خود گھر کے بھیدی ہیں، جیسا کچھ عملی دنیا میں انھوں نے اس نظام کو پایا ہے، بے کم و کاست بیان کر رہے ہیں۔ اس رسالے کی توسیع اشاعت نہ صرف اخلاقی و علمی بلکہ دینی خدمت ہے۔ فتعاونوا علی البر والتقوی۔
اگرچہ ان مہاجرین کو ہندستان آئے ہوئے ابھی کل سال ڈیڑھ سال ہوئے ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب میں حیرت انگیز مہارت پیدا کر لی ہے۔ اس لیے رسالے کی ادبیت بھی زیادہ "بدیشی" نہیں ہے۔ ہمارے ترک بھائیوں کے لیے اسلام کی قومیت اور ملیت کافی ہے۔ انھیں "چنگیز" جیسے فاتحوں پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

(مطبوعات، مولانا صدر الدین اصلاحی، ترجمان القرآن، جلد ۱۳، عدد ۵، ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ، جنوری ۱۹۳۹ء، ص ۳۹۷-۳۹۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آیئے حالات درست کریں

قاضی حسین احمد

اندھیری شب میں کسی بے نشاں صحرا سے گزرتے ہوئے قافلے سے بچھڑ جانے والے تنہا مسافر کی پریشانی کو تصور میں لائیں۔ اس کے لیے سب سے بڑا نجات دہندہ اور محسن وہ شخص ہو گا جو اس کے راستے کو روشن کر دے اور اسے منزل کا پتا بتا دے۔ انسانیت بھی اسی طرح بھٹک رہی تھی۔ عام لوگ اپنے خالق کی معرفت سے محروم تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ کس نے انھیں پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا۔ انھیں زندگی کس طرح گزارنی چاہیے' حلال کیا ہے' حرام کیا ہے' انھیں کہاں جانا ہے' اپنے جیسے انسانوں پر اس کے کیا حقوق ہیں' اس کے خالق کے کیا حقوق ہیں' اور وہ اپنے پروردگار' اپنے خالق و مالک کو کیسے راضی کر سکتا ہے؟ انسانیت کو یہ رہنمائی اس کے محسن اعظم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ملی اور یہ روشنی اور سیدھا راستہ قرآن کریم نے دکھایا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ (البقرہ ۲ : ۱۸۵)' یعنی لوگوں کے لیے ہدایت و رہنمائی اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کی واضح نشانیاں قرار دیا ہے۔ اس رہنمائی (نزول قرآن) کے لیے رمضان المبارک کے مہینے کو چنا گیا۔ اس احسان عظیم کی شکرگزاری کے لیے ہمیں موقع دیا گیا کہ اس ماہ مبارک میں اللہ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کے لیے روزے رکھیں اور زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کریں۔ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (البقرہ ۲ : ۱۸۵)' اور تاکہ تم اللہ کی عطا کردہ ہدایت پر اس کی کبریائی بیان کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

رمضان کے مبارک مہینے کے روزوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ یعنی اپنے اعمال کے بارے میں' اپنے رب کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا ہو۔ وہ اپنے رب کا ذکر کرتا رہے'

قاضی حسین احمد' جماعت اسلامی پاکستان کے امیر ہیں۔

دل سے بھی اس کی کبریائی بیان کرے، زبان سے بھی اور جسم کو بھی کھانے پینے اور دوسری لذات سے روک کر رکھے۔ یہ تمام اعمال اللہ کی شکرگزاری کے مظہر ہیں، اس بات پر کہ اس نے ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دی۔ روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ برائی اور بے حیائی کے ہر کام سے اجتناب کیا جائے، اپنی زبان کی حفاظت کی جائے، جھوٹ، غیبت اور گالم گلوچ سے زبان کو پاک رکھا جائے، تراویح میں قرآن کریم سننے کا اہتمام کیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیمات سے کماحقہ، آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ترجمان القرآن کے قارئین کو رمضان المبارک کی زیادہ سے زیادہ برکات سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رمضان المبارک کی عین آمد کے موقع پر امریکہ نے ایک بار پھر عراق کے مظلوم مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ رات کی تاریکی میں بے خبر اور معصوم انسانوں پر اندھا دھند میزائلوں کی بارش کر کے سیکڑوں بے گناہوں کو ان کے خون میں نہلا دیا گیا۔ ہسپتالوں، یونی ورسٹیوں اور عبادت گاہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو بھی دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ دراصل یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ پوری دنیا کے سیاہ و سفید کا بلاشرکت غیرے مالک ہے اور اسے ہر جگہ اپنی مرضی کے مطابق مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کے حکم سے سرتابی کرنے والے کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمان حکمرانوں کو جب اس طرح کی کوئی سزا ملتی ہے تو اس وقت ان کو اسلامی تضامن اور امت کا اتحاد یاد آ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات اب ثابت شدہ حقیقت ہے کہ استعماری طاقتوں کے مقابلے میں اپنا تحفظ کرنے کے لیے مسلمانان عالم کے سامنے اتحاد امت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ عراق پر حملے سے قبل افغانستان اور سوڈان کو جس طرح اچانک حملے کا نشانہ بنایا گیا، اس سے تمام مسلمان حکمرانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے تھی لیکن آج بھی بیشتر مسلمان حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مصیبتوں سے بے خبر صرف اپنے مفادات اور اغراض سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ایک طرف امریکہ مسلمانوں کو اتحاد سے محروم اور انتشار سے دوچار کر کے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے اور دوسری طرف حکومت پاکستان امریکہ سے یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ وہ اسے اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے کوئی موثر اقدام کرے گا اور عالمی مالیاتی اداروں کو اس کی امداد کی ترغیب دلائے گا۔ اس مقصد کے لیے میاں نواز شریف نے صدر کلنٹن سے ملاقات کی درخواست کی اور امریکہ کے دورے کی دعوت حاصل کی، لیکن اس دورے کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، انھیں سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دورہ نہ کرنا زیادہ باوقار رویے کا اظہار ہوتا۔ کیونکہ نہ صرف پاکستان کے موقف کو تسلیم نہیں

کیا گیا بلکہ پاکستانی وفد کی سبکی اور توہین بھی کی گئی۔ تقریباً ایک سو افراد کا بھاری بھرکم وفد لے کر جانے اور کروڑوں روپے کے اخراجات کے باوجود میاں نواز شریف بے آبرو ہو کر واپس لوٹے تو یہ محض وزیراعظم کی بے عزتی نہیں بلکہ پوری قوم کی سبکی ہے۔ کیسی عبرت ناک بات ہے کہ کشکول توڑنے کے منشور پر ووٹ حاصل کرنے کے بعد موجودہ حکومت پوری دنیا میں ہر طرف کشکول لیے پھر رہی ہے۔ مگر ہر طرح کی خوشامد کے باوجود کشکول خالی واپس آ جاتا ہے۔ اس ضمن میں تشویش ناک بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان اقتصادی مشکلات سے گھبرا کر نیوکلیئر ہتھیار جیسی اہم دفاعی سدجارحیت کی صلاحیت کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ امریکی نائب وزیر خارجہ سٹروب ٹالبوٹ نے اپنے مضمون میں' جو پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپا ہے' بالکل واضح کر دیا ہے کہ امریکہ کی یہ کمٹ منٹ ہے کہ این پی ٹی پر دستخط کروا کے' سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبران کے علاوہ دوسرے ہر ملک کو نیوکلیئر ہتھیار بنانے کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے امریکی حکومت جس تدریج سے آگے بڑھ رہی ہے' مسٹر ٹالبوٹ نے اس کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ یعنی وہ سی ٹی بی ٹی کے بعد ایف ایم سی ٹی اور پھر این پی ٹی کے ذریعے کامل "ڈی نیوکلیئرائزیشن" کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس واضح اعلان کے بعد یہ کہنا کہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' قوم کو دھوکا اور فریب دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ نہایت خطرناک بات ہے کہ امریکہ کو یقین دہانی کرا دی گئی ہے کہ پاکستان سی ٹی بی ٹی پر ۱۹۹۹ میں کسی بھی وقت دستخط کر دے گا۔ یہ بات طاقتور بھارتی حریف کے مقابلے میں پاکستان کو بے بس اور بے سہارا بنانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد ہمارے اندر یہ سکت باقی نہیں رہے گی کہ کشمیر کے معاملے میں اپنے اصولی موقف پر قائم رہ سکیں یا کشمیری مجاہدین کی کسی بھی قسم کی امداد کر سکیں۔

موجودہ حکومت ہر محاذ پر بکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی ناکامی اور نامرادی تو یہ ہے کہ یہ اقتصادی خوش حالی کا بلند بانگ دعویٰ لے کر آئی تھی' لیکن "بھاری مینڈیٹ" حاصل کرنے کے باوجود اس میدان میں گذشتہ تمام حکومتوں سے زیادہ نااہل ثابت ہوئی ہے۔ تاجروں اور صنعت کاروں نے اس حکومت سے جو امیدیں وابستہ کیں تھیں' وہ چکنا چور ہو گئیں ہیں۔ صنعتیں بند پڑی ہیں اور مزید صنعتیں بند ہو رہی ہیں۔ تجارت صرف ان بنیادی ضرورتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جو قوت لایموت کے لیے ناگزیر ہیں۔ زرعی پیداوار میں بھی مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے اور کپاس وغیرہ کی فصلوں کے لیے جو ہدف طے کیا گیا تھا' وہ بھی حاصل نہیں ہو سکا۔ درآمدات اور برآمدات دونوں میں کمی ہوئی ہے جو صنعتی زوال کی مظہر ہے۔ مہنگائی مسلسل بڑھ رہی ہے' نج کاری کے عمل کے نتیجے میں لاکھوں لوگ بے روزگار ہو

گئے ہیں' حکومتی ادارے مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں' انتظامیہ اور عدلیہ کی ناکامی کا اعتراف فوج کو بے پناہ اختیارات دے کر کیا جا رہا ہے۔ ریلوے اور واپڈا مکمل بربادی کے قریب ہیں۔ صرف ان دو اداروں کے لاکھوں مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے لاکھوں اساتذہ' کلرک اور سفید پوش طبقے کے ملازمین بنیادی ضروریات کے لیے ترس رہے ہیں۔ غرضیکہ پوری قوم ایک پکے ہوئے لاوے کی مانند پھوٹ پڑنے کو ہے۔

اقتصادی اور معاشی زوال کے ساتھ ساتھ پوری قوم اخلاقی زوال سے بھی دوچار ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کے نتیجے میں ہمارا خاندانی اور عائلی نظام' جو امت مسلمہ کا طرہ امتیاز تھا' بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات مستحکم نہیں رہے' خواتین کا احترام ختم ہو رہا ہے۔ روزانہ کے اخبارات اخلاق سوز واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ خودکشی کے روز افزوں واقعات قوم کے اخلاقی زوال کا ثبوت ہیں' اس لیے کہ خودکشی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے میں تو خودکشی کرنے والوں کی نماز جنازہ تک نہیں پڑھی جاتی۔ یہ نہایت درجے کی بے ہمتی' کج روی اور کم حوصلگی ہے کہ ایک شخص خود کو جہنم کی آگ میں جھونک ڈالے۔ مگر مغربی معاشرے کے زیر اثر بے حیائی اور فحاشی کے دوسرے مظاہر کے ساتھ ساتھ خودکشی کا قبیح عمل بھی ہمارے معاشرے میں نفوذ کر رہا ہے۔ اس کو جواز فراہم کرنے کے لیے غربت کی دلیل دی جاتی ہے جو قطعاً غلط ہے۔ دراصل یہ رجحان اخلاقی پستی کی وجہ سے ہے۔ صرف اللہ اور روز آخرت پر ایمان سے محروم شخص ہی خودکشی کر سکتا ہے۔ تاہم ہمارے حکمران قوم کے اخلاقی زوال میں تیزی سے اضافے کا سبب بن رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کا کلچر عام کیا جا رہا ہے۔

اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اگر روشنی کی کوئی کرن موجود ہے اور ملک و قوم کو سہارا دینے کی صلاحیت کہیں نظر آتی ہے تو وہ ہمارے نوجوان ہیں' جو اس خود غرض' مادہ پرست اور نفس کی بندگی کے ماحول سے نکل کر جہاد کی زندگی اختیار کر رہے ہیں۔ الحمدللہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے نوجوان موجود ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ کسی طرح انھیں کشمیر' فلسطین' بوسنیا اور چیچنیا وغیرہ میں مظلوم مسلمانوں کا سہارا بننے کا موقع ملے۔ جہاد کا جذبہ اور شہادت کی آرزو لیے ہوئے یہ نوجوان پہاڑی کے چراغ ہیں۔ مغربی ثقافت اور بود و باش کے مقابلے میں جہادی کلچر عام کرنے کے لیے نوجوان تنظیموں نے غیر معمولی کام کیا ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ ہماری قوم کے تن مردہ میں زندگی کے شرارے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ امت مسلمہ پر جہاں بھی کوئی افتاد پڑتی ہے' ہمارے گلی کوچوں میں انھی مذہبی تنظیموں کے نوجوان' علماے کرام اور ائمہ مساجد کے ذریعے قوم کے اجتماعی ضمیر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بڑی پارٹیاں کہنے والوں کا تو وجود بھی معصیت

کے وقت کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ افغانستان یا سوڈان پر حملے ہوں، یا عراق پر حالیہ امریکی حملہ، ان نام نہاد بڑی پارٹیوں کے رویے سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ انھیں امت کی اجتماعی مفاد یا غم و الم سے کوئی غرض نہیں۔ دراصل یہ نام نہاد بڑی پارٹیاں مفاد پرستی، خود غرضی اور اسٹیبلشمنٹ کے سہارے پر قائم ایسے گروپ ہیں جو عوام کے لیے سراسر اجنبی ہیں لیکن اپنے سرمائے، روایتی جاگیردارانہ رعب داب اور اثر و رسوخ کی وجہ سے بے زبان اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے عوام پر تسلط حاصل کر لیتے ہیں۔ امت پر جب کبھی کوئی افتاد پڑتی ہے، تو گلی کوچوں میں جماعت اسلامی کے کارکن نظر آتے ہیں یا علما کے کچھ گروہ سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کے مذہبی رہنما درد مشترک اور قدر مشترک رکھنے کے باوجود اپنے اپنے مسلک کی، حد سے بڑھی ہوئی محبت کی وجہ سے مشترک چیلنج کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں قربانی کے جذبے اور دین کے ساتھ گہرے لگاؤ کی کمی نہیں، لیکن باہمی یگانگت اور یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی قوتیں آپس میں ٹکرا کر ضائع ہو رہی ہیں۔ ماضی میں مختلف مسلکوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام کے درمیان اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں، وقتی طور پر اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہو جاتے ہیں لیکن موجودہ حالات میں اس بات کے امکانات کم نظر آتے ہیں کہ یہ متحد ہو کر کسی بڑے چیلنج کے مقابلے میں ہراول دستہ بن سکیں۔ ملک کے ہر گلی کوچے میں مخلص اور نیک دل افراد موجود ہیں لیکن تنہا کسی فرد کے لیے ممکن نہیں کہ اچھے جذبات رکھنے کے باوجود کوئی بڑا نتیجہ پیدا کر سکے۔ بڑے نتائج حاصل کرنے کے لیے اور ہمہ گیر اور ہمہ پہلو اصلاح کے لیے کسی بڑی اجتماعی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پورے ملک میں نظر جماعت اسلامی ہی پر ٹھہرتی ہے جس کی تنظیمی صلاحیتوں، مقصد کے ساتھ لگن اور امانت و دیانت کے اعلیٰ معیار کے اس کے مخالفین بھی قائل ہیں۔ اکتوبر ۹۸ میں اسلام آباد کے اجتماع میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور قومی اور بین الاقوامی پریس نے بھی اس کا اعتراف کر لیا کہ جماعت اسلامی اپنی تنظیمی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس ملک اور قوم کے لیے ایک نعمت ہے۔ دو لاکھ سے زیادہ لوگوں (مردوں، عورتوں اور بچوں) کو شامیانوں کے ایک شہر میں بسانا، انھیں ملک کے مختلف حصوں سے جمع کرنا اور پھر پرامن طور پر انھیں اپنے گھروں تک واپس پہنچانا، ان کی ساری ضروریات پوری کرنا اور محبت و یک جہتی کی فضا میں ان کو باہم شیر و شکر کر کے ایک خاندان میں تبدیل کر دینا، افراتفری اور بدامنی کے اس ماحول میں روشنی کا ایک مینار ہے۔ اس سے ملک بھر میں مخلص اور نیک لوگوں کو حوصلہ اور روشن مستقبل کا سراغ ملا ہے۔ لیکن اپنی موجودہ شکل میں جماعت اسلامی ہی قوم کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں۔ جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرے کے تمام اچھے اور اہل افراد کو جذب کرنے کی کوشش کریں۔

ہمارے ملک میں جب بھی کوئی شدید بحران آتا ہے' لوگ حکمرانوں کے ظلم و زیادتی اور بدعنوانی سے پریشان ہو جاتے ہیں اور تبدیلی کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے تو اس کا حل اکثر ایک یک نکاتی ایجنڈے میں تلاش کیا جاتا ہے اور یہ نکتہ حکومت سے نجات حاصل کرنے پر مبنی ہوتا ہے۔ مختلف الخیال عناصر پر مشتمل اتحاد تشکیل پاتے ہیں' وقتی طور پر متفقہ منشور بھی پیش کیے جاتے ہیں لیکن مختلف اور متنافر عناصر جو اپنے سینوں میں مختلف خیال اور آرزوئیں پالتے ہیں' حکومت کو گرانے کا منفی منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچتے ہی ایک بار پھر منتشر ہو جاتے ہیں اور قوم کو اسی مفاد پرست اور خود غرض ٹولے کے چنگل میں چھوڑ جاتے ہیں جو ہر بار ایک نیا اور مختلف لبادہ اوڑھ کر سامنے آ جاتا ہے۔ جماعت اسلامی بھی کئی مرتبہ اس تجربے سے گزری ہے۔ بھٹو کے خلاف قومی اتحاد ہو یا اسلامی جمہوری اتحاد' اس کی روح رواں جماعت اسلامی ہی تھی لیکن ان تحریکوں کے نتیجے میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آ سکی اور ہربار وہی مفاد پرست طبقہ نام بدل کر برسراقتدار آتا رہا۔ نواز شریف کے بعد بے نظیر' بے نظیر کے بعد نواز شریف' نواز شریف کے بعد پھر بے نظیر اور بے نظیر کے بعد پھر نواز شریف' اس عمل سے گزرنے کے بعد یہ دونوں جماعتیں (اصل میں دونوں ایک ہیں) عوام کی نظروں سے گر چکی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عامتہ الناس نواز شریف سے بھی سخت بیزار ہو چکے ہیں' بے نظیر کی قیادت لوگوں کے دلوں میں کوئی امنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ جو لوگ بے نظیر کے گرد جمع ہو کر الائنس بنا رہے ہیں نہ تو قوم کو کوئی لائحہ عمل دے سکیں گے اور نہ ہی لوگ ان کا ساتھ دے کر کسی قربانی کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اس وقت ملک کے عوام انقلابی اور نتیجہ خیز (radical) اقدامات کی تمنا کر رہے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ ایسے سراپا اخلاص لوگ اقتدار میں آئیں جو نہ صرف ملک کی خستہ اور درماندہ حالت میں انقلاب لائیں اور امن و امان کی صورت حال درست کریں بلکہ موجودہ خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ ماحول کو بھی یکسر بدل ڈالیں اور قوم کو مکمل اخلاقی زوال سے بچا لے جائیں۔ اس کام کے لیے انقلابی لوگوں اور انقلابی پروگرام کی ضرورت ہے۔ موجودہ سسٹم یا سیاست دانوں اور اسٹیبلشمنٹ میں یہ صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں کہ وہ اپنی اصلاح آپ کر سکیں۔

اگر ایک بار پھر اسی ڈھنگ اور اسی ڈھب پر انتخابات ہوتے ہیں جس کی اس ملک میں ریت چلی آ رہی ہے تو ووٹرز بڑی حد تک اس عمل سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ پنجاب کے حالیہ بلدیاتی انتخابات میں لوگوں نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ رائے دہندگان کی فہرست میں پچاس فی صد اندراجات غلط ہیں۔ جن لوگوں کے ووٹ بنے ہوئے ہیں وہ علاقے میں موجود ہی نہیں ہیں اور جو موجود ہیں ان کے ووٹ ہی نہیں ہیں۔ حکومتی مشینری راتوں رات پولنگ اسکیم کو تبدیل کر لیتی ہے۔ ووٹر حیران اور پریشان اپنے پولنگ

اسٹیشنوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اس سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو جعلی ووٹ بھگتانے کے فن میں ماہر ہیں۔ وہ سرکاری مشینری کو استعمال کر کے اپنی "مہارت" کو روبہ عمل لاتے ہیں۔ پھر الیکشن کمیشن غیر جانب دار اور آزاد نہیں ہے۔ ایک ایک حلقے کے اندر بیس بیس ہزار جعلی شناختی کارڈ بنے ہوئے ہیں۔ پولنگ سے ایک روز قبل غریب لوگوں میں راشن اور پیسے تقسیم کر کے شناختی کارڈ لے لیے جاتے ہیں۔ اس طرح عوام کی اکثریت انتخاب کے عمل سے ہی مایوس ہو چکی ہے اور ۸۰ فی صد لوگ پولنگ اسٹیشنوں کے قریب پھٹکنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ مایوس لوگوں کے دلوں میں امید کی شمع روشن کی جائے۔ ملک بھر کے ہر گلی کوچے میں لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی قسمت آپ بنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ۱۳: ۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام الناس کو مایوسی اور قنوطیت سے نکالا جائے اور ان کے دلوں کو یقین کی روشنی سے معمور کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف ۱۲: ۸۷) "اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔ ہم تو دنیا میں امید کی روشنی عام کرنے آئے ہیں۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم پوری انسانیت کو یقین دلائیں کہ اللہ کا دامن رحمت بہت وسیع ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر ۳۹: ۵۳) "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ" --- اور وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمرٰن ۳: ۱۳۹) "دل شکستہ نہ ہو' غم نہ کرو' تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو"۔

یہ وقت ہے کہ اس قوم کے ہر فرد کے دل کو ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال کر دیا جائے۔ پاکستان کے ہر مزدور' کسان' طالب علم' کلرک' استاد اور نچلے و متوسط طبقے کے سفید پوش' باشعور شہری' قوم و ملک کا درد رکھنے والے ہر دانش ور اور ہر دردمند پاکستانی کا تعاون حاصل کیا جائے۔ انھیں اس تحریک کے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مکمل' ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلاب کی منصوبہ بندی کی جائے۔ رمضان المبارک کے اس مہینے کو اس عظیم الشان تحریک کی تیاری کے لیے استعمال میں لایا جائے اور جیسے ہی مناسب موقع آئے ایک عظیم الشان اور بابرکت انقلاب برپا کرنے کے لیے عوام سے سڑکوں اور گلی کوچوں میں نکلنے کی اپیل کی جائے۔ اس تحریک کو انتہائی منظم اور پرامن رکھا جائے تاکہ ملک کو مزید انتشار اور بدامنی اور موقع پرست طالع آزماؤں کی دست برد سے بچایا جا سکے۔ اس تحریک کے ذریعے حکومت اور

اسٹیبلشمنٹ کو مجبور کر دیا جائے کہ ملک کی باگ ڈور ایسے مخلص لوگوں کے سپرد کر دیں جو اسے موجودہ اندھیروں سے نجات دلا سکیں۔

ہمارے ملک کا دستور ایک اسلامی انقلابی دستور ہے۔ اس میں ۱۹۴۹ میں پاس کی گئی وہ قرارداد مقاصد بھی شامل ہے جو بجائے خود ایک انقلابی دستاویز ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو اور اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ملک کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق چلایا جائے گا۔ ہمارے دستور میں قرارداد مقاصد کو قومی رہنمائی اور قانون سازی کی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کے مطابق کوئی ایسا شخص کسی اسمبلی کا نہ امیدوار بن سکتا ہے اور نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہ سکتا ہے:

جو امین نہ ہو، جو فرائض ادا نہ کرتا ہو، جو بڑے گناہوں سے اجتناب نہ کرتا ہو اور اچھی شہرت نہ رکھتا ہو۔

یہ انقلابی دستور تو موجود ہے لیکن اس پر عمل درآمد کا کوئی نظام موجود نہیں۔ عوامی دباؤ کے تحت دستور میں اسلامی دفعات تو رکھی گئیں لیکن ملک کی زمام اقتدار انگریز کے تربیت یافتہ سیاست دانوں اور اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ میں رہی۔ وہ اس ملک کے دستور کے خلاف اس پر مسلط رہے۔ اب اس ملک کو اسلامی دستور میں ڈھالنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے آئینی دفعات کو فریب دینے اور دھوکہ دہی کے لیے استعمال کیا، اقتدار و اختیار ان سے چھین لیا جائے، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے اس کلب کو توڑ کر باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جائے جو دستور کے مطابق ملک کا نظام بنانے، چلانے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کے لیے تیار و آمادہ ہوں۔ یہ کام جماعت اسلامی اپنے بے لوث اور مخلص کارکنوں کی مدد سے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہی قوم کو بڑی جدوجہد کے لیے آمادہ کر سکتی ہے۔

عموماً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس تحریک میں جماعت اسلامی کے علاوہ اور کون کون سی جماعتیں شامل ہیں۔ یہ سوال دراصل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ قوم مستقل طور پر گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس قوم کی بڑی تعداد موجودہ جماعتوں، گروہوں اور فرقوں سے الگ اور بیزار ہے۔ ان لوگوں کو اگر ایک عظیم اصلاحی تحریک برپا کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے تو بے غرض اور مخلص لوگ جو موجودہ گروہ بندیوں سے وابستہ ہیں، وہ بھی آزاد ہو کر اس تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دینی اور مذہبی جماعتوں سے وابستہ افراد بھی مسلکی عصبیت اور فقہی تنگنائیوں سے نکل کر امت کے اجتماعی مفاد کی خاطر کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ علمائے کرام، ائمہ اور خطیب حضرات کی بہت بڑی تعداد بھی ان شاء اللہ اس کام میں ممد و معاون ثابت ہو گی۔

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاس میں اس طرح کی تحریک چلانے کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا ہے لیکن اس پر عمل در آمد کرنے کے لیے مناسب تیاری اور معاشرے کے تمام نیک دل افراد اور اصحاب عظمت کو ساتھ ملانے کے لیے ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا کام کرنا ہو گا۔ قارئین ترجمان القرآن بھی ایک ممتاز حلقہ رکھتے ہیں۔ اس میں قوم کی رہنمائی کرنے والے دانش ور بھی شامل ہیں۔ اگر آپ حضرات بھی اپنے حلقے کے اندر سرگرم عمل ہو کر اس تحریک کو قوت فراہم کرنے کا بیڑا اٹھالیں تو نہ صرف بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ عنداللہ اپنے فرض سے عہدہ برآ بھی ہو سکیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس بڑے کام میں شرکت کے لیے اپنے قریب ترین ذمہ داران جماعت اسلامی سے رابطہ کریں اور اپنی خدمات انھیں پیش کریں۔ اگر آپ کسی گاؤں میں رہتے ہیں تو گاؤں کے لوگوں کو جمع کریں' شہر میں رہتے ہیں تو محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے اس کام میں حصہ لینے پر آمادہ کریں۔ جس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں' اس کے امام اور نمازیوں کو اس کام کے مشورے میں شریک کریں۔ آپ یقین جانیں یہ وہ کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا اور پیغمبر آخر الزماں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا' اسی کام کے لیے یہ امت مبعوث کی گئی اور امت مسلمہ کو اسی کام پر اکٹھا کرنے کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا۔

آج پاکستان کے حالات کتنے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں' عوام کے اندر ان کا شعور اور بیداری ہمارا حقیقی سرمایہ اور امید کا پیغام ہے۔ ملک کے اصل دشمن وہ ہیں جو مایوس ہیں اور مایوسی پھیلاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی قوموں کی مثالیں کم نہیں' جو زوال کے بعد عروج کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھیں' جدوجہد کریں تو یقیناً اللہ کی مدد آئے گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رستے میں نکلنے والوں کو رستہ بھی دکھاتا ہے اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ آج کے پاکستان کا' اور ہماری آنے والی نسلوں کا' ہم سے یہ تقاضا ہے کہ ہم خود غرضی اور ذاتی مفادات کی روش ترک کر کے' اعلیٰ مقاصد کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ یہی میرا آپ کے لیے پیغام ہے' یہی ملک کے ہر خیر خواہ کا مقدس ترین فریضہ ہے۔

نومبر کے شمارے میں قارئین کی آرا جاننے کے لیے ہم نے ایک سوالنامہ شامل اشاعت کیا تھا۔ اس کے پانچ سو (۵۰۰) کے قریب جوابات موصول ہوئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ قارئین نے اس میں دلچسپی لی۔ انھوں نے عمومی طور پر رسالے کو مفید پایا اور اس کے معیار پر اظہار اطمینان کیا ہے۔ بعض پہلوؤں کی طرف توجہ بھی دلائی گئی۔ ہم اس سروے میں شرکت کرنے والے تمام قارئین کے بے حد ممنون ہیں۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہم ان کی آرا کو پیش نظر رکھ کر آیندہ ترجمان القرآن کو بہتر اور مفید بنائیں تاکہ وہ ان مقاصد کو پورا کرے جن کے لیے اس کا اجرا کیا گیا۔ ہماری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو اس رسالے میں شائع ہونے والی حق بات کے لیے کھول دے۔ (مجلس ادارت)

کیا آپ اپنی آمدنی دوگنا کرنا چاہتے ہیں؟

یعنی ۱۰۰ فیصد اضافہ

آزمودہ نسخہ ہے:

آمدنی کا ۱۰ فیصد اللہ کی راہ میں بالالتزام انفاق کرنا شروع کر دیجیے

۱۰ گنا اجر سے آمدنی دوگنی ہو جائے گی

دوگنی ہی نہیں بلکہ اضعافاً مضاعفہ

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے

ایک دانا بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں (البقرہ)

اللہ کی بات سے زیادہ سچی بات کس کی ہے؟

ومن اصدق من اللہ قیلا

پس آئیے اس نسخہ کو سچا جانیے اور دل اور جیب کھول کر آگے بڑھیے۔ پیچھے رہنے

والے اور وقت پڑنے پر پچھتانا فضول ہے!!

اشتہار

(خیر خواہ)

وقت کی معلومات اور حدیث کی صحت

ایک جگہ مصنف [مولانا حمید الدین فراہی] نے احادیث کی کمزوری ثابت کرتے ہوئے چند مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے، جو بخاری اور مسلم نے وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ (سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے) کی تفسیر میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے نقل کی ہے کہ مستقرها تحت العرش (سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے) اور فانها تذهب حتی تسجد تحت العرش (اور وہ جا رہا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے)۔ مصنف نے اس حدیث کو ایسا بدیہی البطلان سمجھا کہ اس کو باطل ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ لیکن اس قسم کا حکم لگانے میں انھوں نے ویسی ہی غلطی کی ہے، جیسی ان سے پہلے کے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ اپنے عہد کی معلومات پر بسا اوقات انسان اتنا زیادہ بھروسا کرنے لگتا ہے کہ گویا وہ علم کی آخری حد کو پہنچ چکا ہے، اور اسی مبالغہ آمیز اعتماد کی وجہ سے وہ اکثر ان چیزوں کو بے تکلف غلط بلکہ بدیہی البطلان قرار دے بیٹھتا ہے جو اس کے وقتی علم کے خلاف ہوتی ہیں۔ حدیث کے معاملے میں تو ایسے احکام لگا دینے کی جرأت زیادہ آسان ہے کیونکہ راویوں کو جھوٹا قرار دے دینا کون سا مشکل کام ہے۔ رہا قرآن تو جو لوگ ایمان سے محروم ہیں وہ اس کو بھی نعوذ باللہ مہمل کہہ دینے میں تامل نہیں کرتے۔ البتہ اہل ایمان کو جب وہاں ایسی کوئی چیز نظر آ جاتی ہے تو وہ کچھ دیر کسمسانے کے بعد آخرکار عجیب عجیب تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر علم انسانی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ایسے مواقع پر قطعیت کے ساتھ حکم لگا دینے کی جرأت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔

فلکیات سے متعلق کچھ مدت پہلے تک انسان کا علم اس قدر محدود تھا کہ وہ اپنے نظام شمسی ہی کو کائنات سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ سورج ہے جو اپنی جگہ قائم ہے۔ اس علم پر اس کو اتنا وثوق تھا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ (سورج چل رہا ہے) کی حقیقت ہی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (اپنے مستقر کی طرف جا رہا ہے) کو سمجھ سکتا۔ اسی بنا پر لوگ اس آیت کی تاویل میں ٹھوکریں کھایا کرتے تھے، اور بعض کم فہم اس سے یہ نتیجہ بھی نکال بیٹھتے تھے کہ یہ خدا کا نہیں بلکہ ایک امی عرب کا کلام ہے (نعوذ باللہ)۔ لیکن اب فلکیات کے جدید مشاہدوں سے یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ سورج اپنے پورے نظام کو لیے ہوئے کسی طرف جا رہا ہے، اور اس نظام شمسی کے علاوہ بے شمار دوسرے

سورج اپنے

نظامات بھی ہیں جن کے مرکز اپنے متعلقین کو لیے ہوئے اسی طرح فضائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں۔ جن ستاروں کو اب تک ثوابت سمجھا جاتا تھا، قریب قریب وہ سب کے سب متحرک پائے گئے ہیں اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۰ میل سے ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کی رفتار سے وہ اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ اب صرف یہ امر پردۂ خفا میں رہ گیا ہے کہ وہ "مستقر" کون سا ہے جس کی طرف یہ مختلف نظامات فلکی کے مرکز رواں دواں ہیں؟ اس سوال کو انسان اب تک حل نہیں کر سکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اسے کائنات کے مرکز کا پتا نہیں چل سکا۔ بہت ممکن ہے کہ کائنات میں ایک مرکزی نقطہ ایسا ہو جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلیات کو مرتکز فرما رکھا ہو، اور وہیں سے سورج اور دوسرے نظامات کے مرکزوں پر اس قوت (انرجی) کا فیضان ہو رہا ہو جو بے حد و حساب پیمانے پر ان مرکزوں سے ہر آن ان کے تابع ستاروں پر منعکس ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی مرکز کائنات کا نام کلام الٰہی میں عرش رکھا گیا ہو۔ ممکن ہے کہ یہی عرش اس سورج اور تمام سورجوں کا "مستقر" ہو۔ ممکن ہے کہ اسی مستقر کی طرف ان کے حرکت کرنے کو اللہ کے نبیؐ نے "سجدہ" سے تعبیر کیا ہو۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اب تک انسان پر منکشف نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن جو امر اس نظریے کو تقویت پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ فلکی طبیعیات (Astro-physics) کے ماہرین آج تک اس سوال کو حل نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بے حد و بے حساب قوت جو سورج سے ہر لمحے خارج ہو رہی ہے، اس کا ماخذ و منبع کیا چیز ہے؟ جتنے نظریات انھوں نے قائم کیے ہیں وہ سب تشنہ ثبوت ہیں اور تھک کر انھیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی "غیر معلوم" سرچشمہ (unknown source) ہے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ "غیر معلوم" سرچشمہ سورج کے جِرم [جسم] میں نہیں ہے، بلکہ اس کے باہر کائنات کے مرکز میں ہے، اور وہاں محض طبیعی اسباب سے قوت پیدا نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایک فوق الطبیعی ماخذ سے قوت کا فیضان ہو رہا ہے، والعلم عند اللہ۔

پس یہ ایک بڑی غلطی ہے، جس پر لوگوں کو متنبہ ہو جانا چاہیے کہ انسان اپنے وقت کی معلومات کو حتمی و یقینی سمجھ لے اور ان کے خلاف جب کوئی حدیث یا آیت قرآنی نظر آئے تو اس کو مہمل قرار دینے لگے۔ انسان پر حقائق کا علم آہستہ آہستہ منکشف ہو رہا ہے اور اس ترقی کے ساتھ ساتھ وہ مسلّمات خود ہی غیر مسلّم ہوتے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر احادیث اور آیات میں غلطیاں نکالنے کی جرات کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ احادیث میں ضعیف اور موضوع روایتیں نہیں ہیں۔ ہیں، اور ضرور ہیں۔ مگر جن حدیثوں کی سند قوی ہو ان کے معاملے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ (فاتحہ، تفسیر نظام القرآن، مطبوعات، ترجمان القرآن، ج ۱۴، عدد ۱، محرم ۱۳۵۸ھ، مارچ ۱۹۳۹، ص ۷۰-۷۲)

رمضان المبارک

مولانا عبدالمالک

رمضان المبارک کا مغفرت و رحمت اور آتش جہنم سے رہائی کا مہینہ سایہ فگن ہے۔ اللہ تعالیٰ مائل بہ کرم اور منتظر ہیں کہ جو بندہ چاہے، آئے اور جھولی بھر کر لے جائے۔ پھر یہ موقع گیارہ ماہ بعد آئے گا۔ بہت سوں کے لیے یہ یقیناً آخری موقع ہے۔ کوئی ضمانت نہیں کہ ہمارے لیے یہ موقع، آخری نہ ہو۔ کیوں نہ سترگنا زیادہ نفع دینے والے یہ اوقات ہم اس طرح ترتیب دیں کہ کم سے کم وقت ضائع ہو، اور زیادہ سے زیادہ وقت بعد کی، ہمیشہ کی زندگی کی نعمتیں حاصل کرنے کے لیے سرمایہ کاری میں صرف ہو۔ تلاوت قرآن، عبادات، نوافل، انفاق، برائیوں سے پرہیز اور سبقت الی الخیر کے اہتمام کے ساتھ ساتھ، مطالعہ حدیث کو بھی اپنے معمولات میں شامل کیجیے کہ یہ اللہ کے رسولؐ کی صحبت میں بیٹھنے کی مشق ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابن آدم کا ہر کام، اس کے لیے ہے، مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا۔

روزہ ڈھال ہے، اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ اس دن فحش بات نہ کرے، شور نہ کرے، اگر کوئی اسے گالی دے، یا لڑائی لڑے تو دو مرتبہ کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں۔

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے، روزے دار کے منہ کی مہک اللہ کے نزدیک کستوری کی بو سے زیادہ خوشبودار ہے۔

روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ جب افطار کرتا ہے تو افطار پر خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزے پر خوش ہوگا۔ (الفتح الربانی ترتیب مسند احمد)

روزے کی کئی خصوصیات اسی کے ساتھ خاص ہیں۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ روزے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص قرار دیا ہے یعنی یہ ایسی عبادت ہے جو کسی دور میں بھی اللہ کے سوا کسی باطل معبود کے لیے نہیں کی گئی۔

مولانا عبدالمالک، مرکز علوم اسلامیہ، منصورہ، لاہور میں شیخ الحدیث ہیں۔

○ یہ ایسی عبادت ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہوتی ہے، اس لیے اس میں ریاکاری کا احتمال نہیں ہے۔ ○ کھانے سے استغنا اللہ کی شان ہے۔ روزے کے ذریعے اللہ کا قرب کھانے پینے اور خواہش نفس کو ترک کرنے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ○ روزے کے ثواب اور اس میں بڑھوتری کی مقدار کا علم اللہ نے اپنے لیے خاص کیا ہے جب کہ دوسری عبادات کے ثواب اور اس میں اضافے کا علم بندوں کو بھی ہو جاتا ہے۔ ○ اگر کسی نے گناہ کیے ہوں گے تو اس کی دوسری عبادات قیامت کے روز اس کے مختلف گناہوں کا کفارہ بنیں گی اور ان کے عوض میں وضع ہو جائیں گی لیکن روزہ گناہوں کے عوض میں وضع ہونے سے بچ جائے گا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جزا اللہ تعالیٰ براہ راست دیں گے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ روزہ اللہ کی بندگی ہونے کے ساتھ نفسانی شہوات سے بچانے کا ذریعہ بھی ہے۔ روزے کا مقصد صرف کھانا پینا ترک کر دینا نہیں، بلکہ دوسرے گناہوں اور اخلاقی خرابیوں سے بھی بچنا ہے۔ اس لیے اس حدیث میں روزے کے ڈھال ہونے کے تقاضے کے طور پر بیان کیا گیا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی روزے سے ہو تو پھر فحش بات نہ کرے اور شور و شغب نہ کرے۔ اگر کوئی گالی دے یا لڑائی لڑے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، یا اپنے دل میں اپنے آپ سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے منہ کی مہک اللہ کے نزدیک کستوری سے زیادہ خوشبودار ہے۔

پانچویں اور چھٹی خصوصیت دنیا اور آخرت میں خوشی سے ہم کنار ہونا ہے۔

○

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جنت میں ایک دروازہ ہے جسے "ریان" کہا جاتا ہے۔ قیامت کے روز کہا جائے گا روزے دار کہاں ہیں؟ آؤ ریان کی طرف۔ جب ان کا آخری آدمی بھی داخل ہو جائے گا تو پھر اسے بند کر دیا جائے گا۔ (الفتح الربانی)

دروازے صرف ان روزے داروں کے لیے نہیں ہوں گے جنھوں نے فرض تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہو بلکہ ان کے لیے بھی ہوں گے جنھوں نے فرائض ادا کرنے اور منکرات سے اجتناب کے ساتھ بعض عبادات کے ساتھ خصوصی شغف رکھا ہو اور فرائض کے علاوہ نوافل میں انہماک کیا ہو۔ رمضان کے مہینے کے علاوہ گیارہ مہینوں میں نفلی روزے بھی رکھتے رہے ہوں، روزے کے ساتھ خصوصی لگاؤ رکھا ہو۔ کسی نے نفل نمازوں پر زور دیا ہو۔ کسی نے نفل جہاد میں زندگی لگائی ہو۔ کسی نے علمی میدان میں ترقی کی ہو۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے جنت میں استقبالی دروازہ بنایا جائے گا۔ کسی کے لیے ریان، کسی کے لیے علم، کسی کے لیے نماز اور کسی کے لیے جہاد کے دروازے ہوں گے۔

ایک موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کوئی آدمی ایسا بھی ہو گا جس کے استقبال کے لیے آٹھوں دروازوں میں انتظام ہو اور اسے ہر دروازے سے پکارا جائے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں، اور مجھے امید ہے کہ آپؓ ان میں سے ہوں گے۔ یعنی کچھ شخصیات ایسی بھی ہوں گی جو تمام عبادات میں جامع ہوں گی اور ان کو ان کی جامعیت کی وجہ سے ہر دروازے سے پکارا جائے گا۔ ان کے استقبال کے لیے ہر دروازے پر اہتمام ہو گا۔ اس حدیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرائض کو ادا کرنے کے بعد نفلی میدان میں لوگوں کی چاہتیں اور شوق مختلف ہو سکتے ہیں۔ کسی کو ذکر و اذکار اور نفلی نمازوں کا شوق ہو سکتا ہے، کسی کو روزے کی تڑپ ہو سکتی ہے، کسی کو دعوت الی اللہ کی لگن اور کسی کو جہاد کا ولولہ۔

○

حضرت ابو السلیلؓ سے روایت ہے کہ مجھے باہلہ قبیلے کی بڑھیا مجیبہ نے اپنے باپ یا اپنے چچا سے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا: آپؐ مجھے پہچانتے نہیں۔ آپؐ نے پھر پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے عرض کیا کہ میں باہلی ہوں۔ گذشتہ سال میں جناب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا! تم تو میرے پاس آئے تھے اس حال میں کہ تمھارا جسم، تمھارا رنگ اور تمھاری ہیئت اچھی تھی، پھر تمھارا یہ حال، جو میں دیکھ رہا ہوں، کیسے ہو گیا؟

اس نے عرض کیا کہ آپؐ کے پاس سے جانے کے بعد میں نے افطار نہیں کیا مگر تھوڑے دن (یعنی روزوں سے رہا ہوں)۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: کس نے تجھے کہا تھا کہ اپنے نفس کو تکلیف دو۔ کس نے تجھے حکم دیا تھا کہ اپنے نفس کو عذاب پہنچاؤ۔ کس نے تجھے کہا تھا کہ اپنے نفس کو تکلیف دو (یعنی یہ کہ اس قدر روزے رکھو کہ کمزور ہو جاؤ۔ کمزوری ہیئت کو بگاڑ دے، ٹھیک نہیں ہے اور نہ ہی اسلام میں یہ صورت مستحسن ہے)۔

آپؐ نے فرمایا: ماہ صبر کے روزے رکھو۔ میں نے عرض کیا: میں مزید کی قوت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر مہینے میں ایک روزہ اور رکھ لو۔ اس نے عرض کیا کہ میں مزید قوت رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپؐ مجھے مزید اجازت دیں۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو پھر مہینے میں دو دن رکھ لو۔ میں نے عرض کیا: میں طاقت رکھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپؐ میرے لیے مزید روزوں کا اضافہ فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم ماہ صبر اور مہینے کے دو روزوں کے علاوہ اور کیا چاہتے ہو؟

میں نے عرض کیا: میں قوت پاتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپؐ میرے لیے مزید روزوں کا اضافہ فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو پھر ہر مہینے میں تین دن روزے رکھ لو۔ آپؐ تین پر رک گئے، مزید آگے

بڑھنے والے نہ تھے۔ میں نے کہا کہ میں قوت پاتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپؐ مجھے مزید کی اجازت دیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اچھا تو پھر حرام مہینوں کے روزے رکھو اور افطار کرو۔ ابوداؤد کی روایت میں اس طرح الفاظ آتے ہیں: "حرام مہینوں کے روزے رکھو بھی اور چھوڑو بھی۔ حرام مہینے کے روزے رکھا بھی کرو اور چھوڑا بھی کرو۔ حرام مہینے کے روزے رکھا کرو اور چھوڑا کرو۔ اپنی تین انگلیوں سے اشارہ کیا اور انھیں آپس میں ملایا۔ پھر انھیں چھوڑ دیا"۔ مقصد یہ ہے کہ تین روزے پے در پے رکھنے کے بعد پھر وقفہ کرو اور تین دن ناغہ کرو۔

○

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک رسی دو ستونوں کے بیچ میں تنی ہوئی ہے۔ آپؐ نے پوچھا یہ رسی کیسی؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ ام المومنین زینبؓ نے تانی ہے۔ جب وہ نماز میں کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اس سے لٹک رہتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں (یہ رسی نہیں ہونا چاہیے) اسے کھول ڈالو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ جب تک دل لگے نماز پڑھے، تھک جائے تو بیٹھ جائے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس بنی اسد کی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ اتنے میں رسولؐ اللہ تشریف لے آئے۔ آپؐ نے پوچھا یہ خاتون کون ہیں؟ میں نے کہا فلاں عورت ہے، جو رات، کو نہیں سوتی۔ پھر اس کی نماز کا حال بیان کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: بس بس، اتنا عمل کرو جتنا کرنے کی طاقت ہے۔ اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں تھکتا، تم ہی عمل کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ (بخاری)

نیکی اور عبادت کا شوق اچھی چیز ہے، لیکن اس میں بھی انتہا پسندی مطلوب و محمود نہیں۔ ہمارے دین کا سنہرا اصول اعتدال ہے، اس کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے، اس بارے میں دین کا مزاج بہت واضح ہے۔

○

حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے، فرمایا: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا تھا کہ ہم عید کے دن نکلیں، یہاں تک کہ کنواری عورت بھی پردے میں سے نکلے، اور حائضہ بھی نکلتیں۔ وہ لوگوں کے پیچھے رہتیں، مردوں کے ساتھ تکبیر کہتیں، ان کے ساتھ دعا میں شریک ہوتیں، اور عید کے دن کی برکت اور پاکیزگی حاصل کرنے کی امید رکھتیں۔ (بخاری، کتاب العیدین)

مدینہ کا معاشرہ قائم کرنے کا تقاضا ہے کہ خواتین حدود حجاب کے ساتھ عیدین کی طرح کی اجتماعی سرگرمیوں میں شریک ہوں، ایک دوسری روایت کے مطابق، آپ خطبہ ختم کرنے کے بعد خواتین کی طرف آتے اور انھیں علیحدہ سے خطاب کرتے۔

قبر اور آخرت کی تیاری

الشیخ عبدالرحمٰن السدیس

ترجمہ : مزمل حسین کپاڈیہ

میں اپنی ذات کو اور آپ سب کو جلوت و خلوت' ظاہر و باطن' تنہائی اور مجالس میں' ہر حال میں تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اللہ کا خوف بندہ مومن کے لیے قبر میں سب سے زیادہ قابل قبول سامان ہے۔ یہ یوم آخرت کے لیے سب سے پسندیدہ توشہ ہے۔ یوم آخرت وہ دن ہے کہ جب دلوں کے بھید جانچے جائیں گے' تمام پوشیدہ چیزیں منکشف کر دی جائیں گی' دل غم سے بھر کر گلوں تک آ رہے ہوں گے۔ اس دن مال و دولت کے ذخائر کچھ فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

وہ کون ہے کہ دوام و بقا صرف اسی کے لیے ہے' جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے' اس پر کبھی موت نہیں آئے گی' جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے' اس پر کبھی فنا اور زوال نہیں آئے گا' وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے! جب کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فنا و زوال کو مقدر کر دیا ہے' ہر ایک کے فنا اور موت کا وقت مقرر کر دیا ہے' نہ اس وقت میں کوئی کمی ہو گی اور نہ ہی زیادتی۔

موت جس کی جستجو میں ہو وہ اس سے فرار کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے لیے قبر کو ٹھکانا بنا دیا گیا ہو وہ دنیا کو اپنا ٹھکانا اور جائے قرار کیسے بنا سکتا ہے۔ مال و اولاد نے' عمارتوں اور محلات نے ہم کو موت اور قبر سے غافل کر دیا ہے۔ ہم نئے انداز کی لذتوں میں ایسے غافل ہیں کہ گویا ہمیں اپنی قبروں میں جانا ہی نہیں؟ دلوں کی سختی اور اس غفلت پر اللہ سے شکوہ ہی کر سکتے ہیں۔

اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے جدائی دلوں پر کس قدر اثرانداز ہوتی ہے' لیکن جو اللہ کی قدرت اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ موت ہر ذی نفس کا مقدر ہے اور یہی اللہ کی سنت اور اس کا طریقہ ہے' وہ اس فراق پر راضی برضا ہوتے ہیں اور اللہ کے فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ ابھی غفلت اور بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں اور اپنی سرکشی پر اڑے ہوئے ہیں اور بھٹکے ہوئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”لوگوں کا حساب یعنی اعمال کے نتائج

کا وقت نزدیک آ پہنچا ہے اور وہ غفلت میں پڑے اس سے منہ پھیر رہے ہیں"۔ (سورۃ الانبیاء ۲۱:۱)

موت سے غافل لوگوں کے طرزِ عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ موت سے مستثنیٰ ہیں اور موت ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا مقدر ہے۔ ہمیں دنیاوی لذات نے اپنے اندر گم کر لیا ہے۔ ہم غافل کرنے والی اور دھوکا دینے والی چیزوں میں مشغول ہو گئے ہیں۔ شہوتوں اور لذتوں کے دریا میں غرق ہو گئے ہیں۔ ہم غفلت میں ایسے پڑے ہیں گویا ہمیں اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ ہماری حالت ہے جب کہ ہم کس قدر محتاج ہیں! قریب ہے کہ یہ دنیا ختم کر دی جائے اور ہم خدا کے دربار میں حاضر ہوں۔ ہمارے پاس اس کے سامنے پیش کرنے کے لیے کیا ہے؟ کیا ہم نے اپنے نفوس کا محاسبہ کیا ہے؟ کیا ہم اس حالت پر اسی طرح باقی رہیں گے؟ کیا ہماری زندگیاں اسی ڈگر پر چلتی رہیں گی یہاں تک کہ قبر ہمارا ٹھکانہ بن جائے؟ کیا ہم نے کبھی ان جنازوں کے متعلق اپنے آپ سے سوال کیا جن کی نماز ہم اکثر پڑھتے رہتے ہیں؟ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ یہ جنازے کہاں لے جائے جا رہے ہیں؟ ان کو کہاں پیش کیا جا رہا ہے؟ ان کی کیا حالت ہو گی؟ جب ہم مریں گے تو ہماری کیا حالت ہو گی؟ موت وہ اٹل حقیقت ہے جس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہر روز، واعظ موت ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ہم بلند و بالا محلات تعمیر کرتے جا رہے ہیں جب کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمیں مرنا ہے۔ ہمیں جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں کا اچھی طرح علم ہے۔ ہمارے کتنے ہی احباب اور رشتے دار ہیں، جن کو ہم قبر کی منزل کی طرف رخصت کر چکے ہیں۔ قبر وہ منزل ہے جس سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔ کسی کو اس سے مفر نہیں۔ قبر آخرت کے گھر کا وہ پہلا دروازہ ہے جس میں پہلے والے بھی داخل ہوئے اور بعد والے بھی داخل ہوں گے۔ اس میں چھوٹے بڑے، حاکم و محکوم سب کو جانا ہے۔ اس قبر نے اپنی آغوش میں انبیا اور علما کو بھی لیا، اس میں اغنیا اور فقرا، حاکمین اور رعایا، مرد و عورت سب کو جانا ہے۔ پھر یہ قبر آخری منزل نہیں بلکہ پہلی منزل ہے، اس کے بعد آخرت کی منزل بھی آئے گی۔ اس منزل میں نیک اعمال کرنے والوں کے لیے نعمتیں اور برے اعمال کرنے والوں کے لیے جہنم کی آگ ہے۔

میرے بھائیو اور بہنو! آیئے ہم کچھ وقت اس حدیث مبارکہ کے سائے میں گزاریں جو موت کے وقت اور قبر کے سوال و جواب کا منظر پیش کرتی ہے تاکہ ہم اپنی آنے والی اس منزل کی تیاری کر لیں جس سے ہم سب کو گزرنا ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کرامؓ کے ساتھ ایک انصاری صحابیؓ کے جنازے میں شریک ہوئے۔ جب ان کی تدفین ہو گئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے قریب بیٹھ گئے اور ہم بھی آپؐ کے ارد گرد اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ اس کے بعد فرمایا: جب بندہ مومن کا دنیا

سے رخصت ہو کر آخرت کی طرف جانے کا وقت قریب آتا ہے تو آسمان سے روشن اور خوب صورت چہرے والے فرشتے آتے ہیں۔ ان کے پاس جنت سے لائے ہوئے' جنت کی خوشبو سے مہکے ہوئے کفن ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے اس بندہ مومن کے پاس بیٹھ جاتے ہیں یہاں تک کہ موت کا فرشتہ بھی آ جاتا ہے۔ وہ بندہ مومن کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے پاک روح! نکل اور اللہ کی مغفرت اور اس کی رضامندی کی طرف چل۔ جب وہ روح اس میں سے نکل جاتی ہے تو یہ فرشتے پلک جھپکتے میں اسے اس خوشبودار کفن میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کفن سے کرہ ارضی پر پائی جانے والی تمام خوشبوؤں سے اچھی خوشبو اٹھتی ہے۔ وہ اس روح کو لے کر آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ وہ جہاں جہاں سے بھی گزرتے ہیں' فرشتے ان سے سوال کرتے ہیں: یہ پاک روح کون ہے؟ فرشتے اچھے سے اچھے القاب کے ذریعے تعارف کراتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں کی پاکیزہ روح ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس روح کو لے کر دنیا کے قریب والے آسمان پر جاتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں۔ ان کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے آسمان کے فرشتے اس پاکیزہ روح کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کے اعمال علیین میں لکھ دو اور اس روح کو دوبارہ زمین کی طرف لے جاؤ اس لیے کہ میں نے اس کو زمین سے پیدا کیا' اسی میں اس کو لوٹاؤں گا اور پھر دوبارہ اسی زمین سے اس کو نکالوں گا۔ چنانچہ اس روح کو دوبارہ اس بندہ مومن کے جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ پھر دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں' اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے اس کے رب کے دین اور نبی اکرمؐ کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ وہ بندہ مومن ان کے سوالات کا جواب دیتا ہے یہاں تک کہ آسمان سے آواز دینے والے کی آواز آتی ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کے لیے اس کی قبر میں جنت کا بستر بچھا دو' اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کی قبر میں جنت کی جانب ایک دروازہ کھول دو۔ اس کی قبر میں جنت کی ہوا اور اس کی خوشبو آنے لگتی ہے اور جہاں تک اس کی نظر کام کرتی ہے وہاں تک اس کی قبر وسیع کر دی جاتی ہے۔ پھر ایک خوب صورت چہرے والا' خوب صورت لباس والا' خوشبوؤں میں مہکا ہوا ایک شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھیں جو خوش کن چیزیں ملی ہیں اس پر تمھیں مبارک ہو' یہ وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ بندہ مومن اس سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ وہ کہتا ہے کہ میں تمھارا نیک عمل ہوں۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: جب کسی کافر کے دنیا سے رخصت ہونے اور آخرت کی جانب جانے کا وقت آتا ہے تو آسمان سے بدشکل فرشتے نہایت ہی گندا کفن لے کر آتے ہیں اور اس کے قریب بیٹھ جاتے ہیں یہاں تک کہ موت کا فرشتہ بھی اس کے سر کے قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے ناپاک روح! نکل اور اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کی طرف چل۔ جب اس کی روح قبض کر لی جاتی ہے تو وہ فرشتے

پلک جھپکتے میں اس ناپاک روح کو گندے کفن میں ڈال دیتے ہیں اور اس سے زمین پر پائی جانے والی غلیظ بوؤں سے زیادہ گندی اور غلیظ بو اٹھتی ہے۔ وہ فرشتے اس روح کو لے کر جہاں جہاں سے بھی گزرتے ہیں فرشتے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ ناپاک روح کون ہے؟ وہ اس روح کا بد ترین القاب میں تعارف کراتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں کی روح ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس روح کو لے کر دنیا سے قریب والے آسمان پر پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں تو دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی جس کا مفہوم یہ ہے: "ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے"۔

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے اعمال سجین میں لکھ دیے جائیں' بالکل نچلے درجے میں۔ اس کے بعد اس کی روح کو اس کے جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں' اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے اس کے رب' اس کے دین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کرتے ہیں تو وہ واویلا کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ آسمان سے آواز آتی ہے کہ میرے بندے نے جھٹلایا' اس کے لیے جہنم کا بچھونا بچھا دو۔ اور اس کی قبر کا دروازہ جہنم کی طرف کھول دو۔ یہاں تک کہ اس سے جہنم کی گرمائش اور اس کی ہوائیں آنے لگتی ہیں۔ اس پر اس کی قبر اس قدر تنگ کر دی جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھسنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد ایک بدشکل' بدلباس اور بدبودار شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ جو بری چیزیں تم کو ملی ہیں وہ تم کو مبارک ہوں۔ یہ وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تمھارے برے اعمال ہوں۔ اس پر وہ بندہ کافر کہتا ہے کہ اے میرے خدا! قیامت قائم نہ کرنا' قیامت قائم نہ کرنا۔ (سنن نسائی' ابن ماجہ' ابوداؤد' مسند احمد)

یہ حدیث مبارکہ ہر اس شخص کے لیے قابل غور ہے کہ جس کے لیے موت مقدر ہے' مٹی میں جانے کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے' قبر کی مٹی اس کا بچھونا ہے' کیڑے اس کے ساتھی ہیں' منکر نکیر اس سے سوال کرنے والے ہیں' اس کے اعمال اس کے ہم نشین ہیں' قبر اور برزخ اس کا ٹھکانہ ہے' قیامت کے قائم ہونے کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اسے جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک میں جانا ہے۔ جس شخص کی آیندہ کی منزلیں یہ ہوں' اس کو مردوں کی تدفین اور قبروں کی زیارت کے دوران اپنی ان منزلوں اور اس میں پیش آنے والے امور سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

حضرت براء بن عازبؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم آں حضرتؐ کے ساتھ تھے کہ آپؐ نے چند صحابہ کرامؓ کو دیکھا کہ وہ کسی چیز کے ارد گرد جمع ہیں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس چیز پر جمع ہیں؟

آپؐ کو بتلایا گیا کہ یہ کسی کی تدفین کے لیے قبر کھود رہے ہیں۔ آں حضرتؐ تیزی سے ان کی طرف گئے اور قبر پر پہنچ گئے۔ قبر کو دیکھنے کے بعد آپؐ پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد آپؐ صحابہ کرامؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے میرے بھائیو' اس دن کے لیے تیاری کرو۔ (مسند احمد و ابن ماجہ)

ہمارے اسلاف جب قبروں پر حاضر ہوتے تھے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کے غلام حضرت ہانیؒ سے منقول ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہوتی کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی بھیگ جاتی۔ ان سے کسی نے دریافت کیا کہ جب آپ جنت و جہنم کا ذکر کرتے ہیں' اس وقت تو نہیں روتے لیکن جب آپ کو قبر کی یاد آ جائے یا کسی قبر کو دیکھ لیں تو اس قدر شدت سے روتے ہیں' اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔ جو اس منزل میں کامیاب ہوا تو اس کے بعد کی منزلیں بھی اس پر آسان ہوں گی اور جو اس منزل میں کامیاب نہ ہو سکا اس کے لیے اس کے بعد کی منزلیں اور بھی زیادہ مشکل ہوں گی۔ (جامع ترمذی' ابن ماجہ)

حضرت ثابتؒ کہتے ہیں کہ جب ہم کسی جنازے میں شریک ہوتے تھے تو ہم میں سے ہر شخص رو رہا ہوتا تھا۔ ہمارے اسلاف کے خوف اور ان کی قوت ایمانی کا یہ عالم تھا اور ہماری کیا حالت ہے وہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اللہ ہی ہم پر رحم فرمائے۔ اسی طرح یہ بھی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

اسی طرح بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے یہ منقول ہے' قبر آواز لگاتی ہے کہ اے ابن آدم! تجھے کس چیز نے دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اندھیرے کا گھر ہوں' پردیس کا گھر ہوں' تنہائی کا گھر ہوں اور کیڑوں کا گھر ہوں۔

حضرت ابو الدرداءؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ کثرت سے قبرستان جایا کرتے تھے۔ ان سے جب کسی نے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں جو مجھے میری آخرت یاد دلاتے ہیں۔ آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ قبروں کی زیارت کیا کرو' اس لیے کہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

اے اللہ! ہم عذاب قبر سے پناہ مانگتے ہیں' اے اللہ! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آزمایش قبر میں ہماری حفاظت فرمایئے۔ اے اللہ! اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد قبروں کو ہماری بہترین منزل بنا دیجیے ۔ موت اور سکرات موت' قبر اور اس کے اندھیرے میں ہماری مدد فرمایئے! آمین یا رب العالمین!

اے اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور

ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہو گا۔ اے اللہ کے بندو! جب ہم قبر اور اس کے عذاب کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس وقت ہم پر اپنا محاسبہ کرنا لازم ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ان اعتقادی امور کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کریں۔ اپنے اعتقاد کو عملی شکل دیں۔ جو شخص بھی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس نے مرنے کے بعد قبر میں جانا ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جان لے کہ عذاب قبر اور اس کی وحشت سے بچانے والی چیز اللہ تبارک و تعالیٰ پر ایمان کامل اور نبی اکرمؐ کی اتباع کامل ہے۔ اگر اس بات پر ہمارا یقین کامل ہو کہ ہم نے قبر میں جا کر اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا ہے اور قبر میں ہمارے اچھے اعمال ہی کام آئیں گے اور ہمارے برے اعمال کے برے نتائج ظاہر ہوں گے تو پھر نہ ہم عقیدے میں کمزوری آنے دیں' نہ اتباع رسولؐ میں کمی کریں اور نہ ہم سے زنا' جھوٹ' ظلم' رشوت' ملاوٹ اور دوسروں کو اذیت پہنچانے جیسے گناہ سرزد ہوں۔ (خطبہ جمعہ' امام الحرم)

معاصر اسلامی تحریکات کا نظام تربیت و تزکیہ

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

(دوسری اور آخری قسط)

جمعیة العلماء المسلمین الجزائر کا تربیتی نظام

اس تنظیم کا نظام تربیت امام عبدالحمید بن بادیس ؒ کے اس اصول پر کارفرما تھا کہ: "عام مسلمانوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ علما اپنی اصلاح نہ کرلیں۔ علما کی مثال امت کے دل سے دی جاتی ہے۔ جب دل درست ہوتا ہے تو پورا جسم تندرست ہوتا ہے اور جب دل فساد کا شکار ہو جاتا ہے تو سارا جسم فساد و بگاڑ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر ہم عوام کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو پہلے نظام تعلیم کو درست کرنا ہوگا"۔ (ترکی رابح عمارہ، حوالہ بالا، ص ۱۰۱)

یہی نقطہ نظر مولانا حمید الدین ؒ فراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰) کا بھی تھا۔ وہ بھی خرابیوں کی جڑ علما کی فکری و عملی بے راہ روی کو قرار دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ان کی اصلاح نہ ہو، کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ وہ پہلے علما کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور ان کی اصلاح کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عالم اسلامی کے تمام علما کو مخاطب بنانے کے لیے انھوں نے اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ عربی زبان کو بنایا تھا۔ (حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرآن، ترجمہ امین احسن اصلاحی، ص ۱۹-۲۰)

تعلیم و تربیت کے ذریعے اصلاح معاشرہ کے فریضے کی انجام دہی کے لیے جمعیة العلماء المسلمین نے ساڑھے تین سو سے زائد مدارس قائم کیے جن سے ڈیڑھ لاکھ کے قریب علما فارغ ہو کر نکلے۔ ان مدارس کے نصاب میں مندرجہ ذیل کتابیں داخل تھیں: ۱- قرآن کریم اور اس کی تفسیر۔ ۲- الموطا۔ ۳- عربی زبان و ادب اور اسلامی تہذیب سے واقفیت کے لیے بنیادی ماخذ۔ ۴- مقدمہ ابن خلدون۔ (محمد مصطفیٰ طحان، القیادة فی العمل الاسلامی، حوالہ بالا، ص ۶۳-۶۴)

ڈاکٹر عبیداللہ فلاحی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، بھارت کے شعبہ اسلامیات میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔

جمعیة العلما کا بنیادی تصور تھا کہ جزائری نوجوان کی گم گشتہ شخصیت کی بازیافت عرب اسلامی تشکیل پر موقوف ہے۔ ذہنی و فکری تعمیر کے بعد ہی جزائری عوام کو سیاسی و سماجی اور قومی تحریکوں میں شامل کیا جائے تاکہ عرب اسلامی تہذیب کے دائرے میں رہ کر وہ دفاع وطن کا فریضہ انجام دیں۔ اسی لیے جمعیة العلما کے افکار و نظریات میں "عروبہ" کے تصور کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ فرانس کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ جزائری عوام کو عربی زبان سے کاٹ کر فرانسیسی زبان سیکھنے پر مجبور کرے۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۳۸ کو پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کر کے عربی کو غیر ملکی زبان قرار دے دیا گیا۔ اسے جمعیة العلما نے جزائری قوم کی عزت و کرامت پر سنگین حملہ تصور کیا، چنانچہ امام عبدالحمید بن بادیس نے اس قانون کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کرتے ہوئے بیان جاری کیا:

> بخدا ہم اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کو خوب سمجھ چکے ہیں۔ ہم اسلام اور عربیت کے دشمنوں کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ ان شاء اللہ ہم تمام مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود دین اسلام اور عربی زبان کی تعلیم و تدریس کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں اس ارادے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔ ہم کسی قیمت پر اپنے ہاتھوں سے اس کا خون نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارے ہاتھ ہو گا۔ خواہ مشکلات کی کتنی یورش ہو، فتح و نصرت ہمارا مقدر ہو گی، اس لیے کہ ہمارا اس پر مکمل ایمان ہے اور ہم اس کے عینی شاہد بھی ہیں۔ اسلام اور عربی زبان کو ہمیشہ باقی رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے خواہ پوری دنیا اس کی مخالف ہو جائے۔ (انور الجندی، الفکر والثقافة المعاصرة فی شمال افریقیا، حوالہ بالا، ص ۱۵۷)

دلچسپ بات یہ ہے کہ جمعیة العلما المسلمین کا یہ تربیتی نظام سیاست اور سیاسی مسائل و موضوعات سے کنارہ کش اور بیزار تھا۔ اس کے دستور میں یہ صراحت موجود تھی کہ: "یہ ایک دینی، اصلاحی اور تربیتی تنظیم ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں" (حوالہ بالا، ص ۱۵۲)۔ اور تنظیم کی دس سالہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے صدر تاسیسی نے جمعیتہ کی مذہبی و اصلاحی ہیئت پر ہی زور دیا۔ انھوں نے فرمایا:

> امت مسلمہ میں کہیں ایسی علمی تنظیم قائم نہ ہوئی جس نے اہل بدعت کی پھیلائی ہوئی بدعتوں کا ان کے دینی و دنیوی اقتدار کے علی الرغم ایسا جم کر مقابلہ کیا ہو جیسا کہ الجزائر کی جمعیة العلما المسلمین نے کیا۔ اس کے آزاد و خود مختار علما نے، جو کسی وظیفہ خواری پر نہیں جیتے تھے، دس سال سے کچھ زیادہ مدت سے اصلاحی مہم کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے صرف اللہ کی

خاطر جہاد کیا ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھوں نے الجزائر کی جمعیۃ العلما المسلمین جیسی دینی تنظیم قائم کی۔ یہاں تک کہ اللہ کے فضل و احسان سے یہ اصلاحی تحریک مضبوط بنیادوں پر مستحکم عمارت کی شکل میں قائم ہو گئی جس کی گھنی سایہ دار شاخیں اور ثمرات طیبہ نہ صرف الجزائر بلکہ پورے شمالی افریقہ پر سایہ فگن ہیں۔ (ترکی رابح عمارہ، حوالہ بالا، ص ۱۲)

تجزیہ نگاروں کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ جمعیۃ العلما المسلمین کا یہ دینی اور غیر سیاسی ہیکل حکمت و مصلحت پر مبنی تھا۔ اور یہ کہ اس کے اغراض و مقاصد، مطالبات اور سرگرمیوں کا رخ سیاسی اصلاح اور دفاع وطن اور جنگ آزادی کی جانب بالکل واضح تھا مگر اس پر اصلاح عقائد، تشکیل مدارس اور تعمیر و تزکیہ نفس کے اہداف غالب اور حاوی تھے۔ (عبدالحمید بن بادیسؒ : الجزائر میں مسلم اصلاحی تحریک کے پیش رو، پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، ج ۱۶، شمارہ ۴، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۷، ص ۴۳۔۷۳۔۷۹)

یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ عبدالحمید بن بادیسؒ اور جمعیۃ العلما المسلمین کی تحریروں میں اسلام اور عربیت دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ "عروبہ" پر فخر اسلام پر فخر کے مترادف تھا۔ اس "عروبہ" کا کوئی تعلق اس "عرب قومیت" سے نہ تھا جو بعد میں لعنت بن کر عالم عرب پر مسلط ہوئی اور اتحاد عالم اسلامی کی راہ میں سنگ گراں بن کر کھڑی ہو گئی۔

الاخوان المسلمون کا تربیتی نظام

اخوان المسلمون کا تربیتی نظام بڑا موثر، جان دار، حیات بخش اور انقلاب پرور تھا اور اس کی بڑی وجہ شیخ حسن البناؒ شہید (مرشد عام اول) کی جاذب نظر، پرکشش اور سحرانگیز شخصیت تھی۔ آپ کی ذات اسلامی تربیت کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ سلسلہ حصافیہ سے وابستگی، اوراد و اذکار کے اہتمام اور وظائف و نوافل اور شب بیداری و تہجد گزاری سے خصوصی شغف نے آپ کی شخصیت میں بڑی دل آویزی پیدا کر دی تھی۔ مرشد عام نے خود ایک رسالہ مناجات تحریر کیا تھا جس میں تہجد اور رات کے پچھلے پہر کی نمازوں کی فضیلت، دعا و استغفار کی اہمیت اور اس سلسلے کی آیات و احادیث اور آثار کا تذکرہ کیا ہے۔ اخوانی کارکنوں میں یہ رسالہ بڑا مقبول ہوا اور تربیتی پروگراموں میں اس سے بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے استفادہ کیا گیا۔ مرشد عام کا ایک دوسرا رسالہ الماثورات ہے جس میں مسنون دعائیں اور اوراد و وظائف شامل ہیں۔ یہ دراصل امام نوویؒ کی تصنیف، الاذکار اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب، الکلم الطیب کے انتخابی حصوں پر مشتمل ہے۔ اخوان نے اس رسالے کو حرز جان بنایا اور اس کی ساری دعائیں یاد کر لیں اور صبح و شام انھیں دوہرانے کو اپنا وظیفہ بنایا۔ (یوسف القرضاوی، التربیۃ الاسلامیۃ ومدرسۃ حسن البنا، ترجمہ اخوان

المسلمون کا تربیتی نظام، از عبداللہ فہد فلاحی، اشاعت ۱۹۸۲، ص ۳۶۔ کتاب، المأثورات کا اردو ترجمہ، تزکیہ نفس، اوراد وظائف کے ذریعے کے نام سے مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور سے شائع ہو چکا ہے)

الاخوان المسلمون نے تزکیہ نفس کے جو وسائل اختیار کیے ان میں ایک "احتسابی چارٹ" کی خانہ پری بھی ہے۔ اس چارٹ میں روز مرہ کی زندگی سے متعلق سوالات درج ہوتے ہیں۔ کارکن ان سوالات کو اپنے سامنے رکھے اور "ہاں" یا "نہیں" میں اس کا جواب دے تاکہ وہ خود محاسبہ کر سکے کہ اس نے اصولوں کی محافظت کی ہے یا اس سے کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ محاسبے کا یہ عمل رات میں ہوتا ہے جب وہ دن بھر کے کاموں کو نمٹانے کے بعد بستر پر دراز ہوتا ہے۔ سوالات کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے:

- کیا آج تم نے تمام نمازیں وقت پر ادا کی ہیں؟
- کیا نماز باجماعت کا اہتمام کیا ہے؟
- کیا آج قرآن سے متعین کردہ حصے کی تلاوت کی ہے؟
- کیا مسنون دعاؤں کا آج تم نے اہتمام کیا؟
- کیا آج اپنے کسی بھائی سے محض اللہ کے لیے ملاقات کی؟ وغیرہ وغیرہ۔ (ایضاً، ص ۳۷)

مرشد عام نے اخوانی کارکنوں کو دس نصیحتیں کی ہیں جو الوصایا العشر کے نام سے معروف ہیں۔ یہ وصیتیں ہر اخوانی کے پاس محفوظ رہتی ہیں اور وہ ہمیشہ ان کی روشنی میں اپنی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ ان وصیتوں میں کہتے ہیں:

۱۔ حالات خواہ کچھ ہوں، اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

۲۔ قرآن کی تلاوت کرو یا اس کا مطالعہ کرو یا اسے سنو یا اللہ کو یاد کرو، اپنا کوئی وقت بے فائدہ کاموں میں صرف نہ کرو۔

۳۔ فصیح عربی بولنے کی کوشش کرو اس لیے کہ یہ اسلام کا شعار ہے۔

۴۔ کوئی بھی معاملہ ہو، اس میں زیادہ بحث مت کرو اس لیے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

۵۔ زیادہ نہ ہنسو، اس لیے کہ جس دل کا تعلق اللہ سے ہو وہ سنجیدہ اور باوقار ہوتا ہے۔

۶۔ ٹھٹھا نہ کرو۔ مجاہد امت، کوشش اور محنت کے علاوہ کسی چیز سے واقف نہیں ہوتی۔

۷۔ مخاطب سے اپنی آواز بلند نہ کرو کہ اس میں رعونت پائی جاتی ہے اور مخاطب کو تکلیف ہوتی ہے۔

۸۔ افراد کی غیبت اور اداروں کی زخم کاری سے بچو اور خیر کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

۹۔ اپنے جس بھائی سے ملو اس کا مکمل تعارف حاصل کرو چاہے وہ تم سے اس کا مطالبہ نہ کرے۔

اس لیے کہ ہماری دعوت کی بنیاد محبت اور باہمی تعارف پر ہے۔

۱۰۔ فرائض بہت ہیں اور وقت کم۔ دوسروں کی ان کے اوقات کے صحیح استعمال میں مدد کرو اور اگر کوئی کام ہو تو اسے جلد نمٹاؤ۔ (ایضاً، ص ۳۲)

الاخوان المسلمون نے جو تربیتی نظام وضع کیا اس کے مطابق ارکان کے چار درجے بنائے گئے۔ پہلا درجہ نصیر یا انصار کا، دوسرا درجہ مجاہد کا، تیسرا درجہ نقیب کا، اور چوتھا درجہ نائب کا۔ ان چاروں درجات کے اراکین کا علمی معیار، ان کے اوصاف و خصوصیات اور شرائط و فرائض کو ذیل کے تین جدولوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے: (جدول اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمایئے)

توضیحات

۱۔ جدول نمبر۱ میں انصار کے لیے بھی اصول ثلاثہ کے مطالعے کی سفارش کی گئی ہے اور نقیبوں کے لیے بھی۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے۔ پہلے درجے کے کارکن بس خلاصہ یاد کریں گے اور دوسرے درجے کے بھی داعی ان پر عبور حاصل کریں گے۔

۲۔ اخوان کے کارکن چار درجوں میں منقسم ہیں۔ صوفیا کی اصطلاح میں یہی لوگ مرشد کے جانشین ہوتے ہیں۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی کارکن علم و ثقافت میں آگے نکل جائے مگر اوصاف و فرائض میں پیچھے ہو یا علم و اوصاف میں ترقی کر لے مگر فرائض میں کوتاہ دست ہو یا فرائض میں تو چابک دست ہو مگر علم و اوصاف میں پسماندہ ہو۔ یہ تمام کیفیات نامطلوب ہیں۔

۴۔ بعض درجات میں پختگی کے لیے اساس کے طور پر حلقوں کا تذکرہ الگ جدول میں موجود ہے۔

۵۔ پہلے درجے کے دستور العمل میں ایمان کا خاص طور سے تذکرہ ہے۔ اگر کسی فرد میں فکری ژولیدگی، اشتباہ یا تشکیک کے جراثیم موجود ہوں تو اسے پہلے ایمان کامل کے حصول کی فکر کرنی چاہیے۔ اسے عقائد پر پختہ ایمان رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے قرآن اور حدیث کا مطالعہ لازم ہے۔ وہ قلبی سکون کے لیے ذکر کا سہارا لے۔

۶۔ دوسرا درجہ عملی و تنفیذی ہے۔ اس کی نشانی استاذ البناؒ نے بتائی ہے کہ یہ خالص صوفیانہ اور خالص سپاہیانہ ہے۔ اس میں غایت درجے کا نظم و ضبط اور سمع و طاعت ضروری ہے۔ اس کے لیے متعدد حلقوں کا اہتمام ضروری ہے: روحانی حلقہ، تاکہ کارکن عبادت گزار بنے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر حلقہ، تاکہ یہ فریضہ اس کے اخلاق کا جزو بن جائے، جسمانی اور ورزشی حلقہ، تاکہ اس کا جسم تنومند اور مضبوط رہے۔ روحانی حلقے میں پروفیسر سعید حویٰ کی کتاب، تربیتنا الروحیة

علم و ثقافت کا جدول (ایضاً، ص مابعد ۱۵۲)

مضمون	پہلا درجہ نصیر/انصار	دوسرا درجہ مجاہد	تیسرا درجہ نقیب	چوتھا درجہ نائب
قرآن	ترتیل سے تلاوت کرنا، سورہ کہف، واقعہ، یس، تبارک الذی، عم پارہ کا ایک حصہ یاد کرنا	سورہ انفال اور توبہ کا مطالعہ اور ممکن ہو تو ان کو یاد کرنا	سورہ بقرہ کا مطالعہ و حفظ، علوم القرآن کے موضوع پر کسی مختصر کتاب کا مطالعہ	تفسیر کی بنیادیں، فی ظلال القرآن کا مطالعہ
حدیث	امام نوویؒ کی چالیس حدیثیں اور مسنون دعائیں		کتاب الاذکار، ریاض الصالحین، علوم حدیث پر کسی کتاب کا مطالعہ	حدیث کی بنیادیں اور اس کا فقہ
اصول ثلاثہ	خلاصہ		اصول ثلاثہ سیریز	
فقہ	نماز، زکوٰۃ کی فقہ۔ کسی فقہ کی کتاب جیسے نور الایضاح کی خواندگی		شرح الکتاب کے منتخب حصے، مراقی الفلاح او کفایه الاخیار، مبسوط فقه	فقہ کا وسیع مطالعہ
اصول فقہ			اختلاف کے لیے فقہ کے اصول، دو فقہوں کی معلومات	اصول فقه۔ ڈاکٹر ادیب صالح
توحید	اصول عقائد اور توحید کی اساسیات		شرح الجوہرہ یا عقیدہ کی اہم بنیادیں	
تصوف	رسالته المسترشدين		تربيتنا الروحية	احياء علوم الدين
عربی زبان			قطر الندی، البلاغة الواضحة، لفظ کی صحت اور خطابت کی مشق کے لیے کسی کتاب کا مطالعہ	شذور الذهب، تحریر کی مشق
تاریخ اسلامی، سیرت صحابہ	نور اليقين، تهذيب السيره، صور من حياة الرسول		حياة الصحابة، مذاكرات الدعوة والداعية	رجلان عن الفتوحات الاسلامية از رئیسؒ
موجودہ عالم اسلام			موضوع پر موجود لٹریچر کا مطالعہ	سارے لٹریچر کا مطالعہ
جدید ثقافت	شبهات حول الاسلام		مولانا مودودیؒ کی کتب	داعیانِ دین کی کتابوں کا مطالعہ
اسلامیات			جدید اسلامی تحریکات کے مصنفین کی کتب جن سے جدید افکار و نظریات کا مطالعہ بھی ہو سکے	معاشیات پر کتابیں جیسے ڈاکٹر نجار کی مدخل الی الاقتصاد الاسلامی
اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے	من اجل خطوط الى الامام		التبشير والاستعمار، الغارة البرو توكولات	مسلسل مطالعہ
فقہ الدعوۃ	الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية		مدخل الى دعوة الاخوان المسلمين، رسالة التعاليم، جند الله ثقافة واخلاقاً	مختلف نظاموں، طریقہ ہائے کار اور دساتیر کا مطالعہ

اوصاف کا جدول (ایضاً' ص ۱۵۹)

مراحل	اوصاف
پہلا درجہ نصیر / انصار	نماز قائم کرنا' زکوٰۃ دینا اور جماعت کے لیے اپنی وفاداری کو خالص کرنا۔
دوسرا درجہ مجاہد	مومنوں کے لیے سراپا رحمت اور کافروں کے لیے سراپا غیظ و غضب۔ جان و مال کی قربانی اور تمام وفاداریوں کو جماعت کے لیے خالص کرنا۔
تیسرا درجہ نقیب	حلم و بردباری' وقار و سنجیدگی جو کسی منصب کے لیے ضروری اور مناسب ہے۔ سخاوت و شرافت' سمع و طاعت' شجاعت و بے باکی۔
چوتھا درجہ نائب	سچائی' امانت داری' اسلام کی مکمل اطاعت' ظاہری و باطنی لحاظ سے اس کے آگے کامل سپر افگندگی' شعور' اشاعت دعوت اور تبلیغ دین' تعلیم و تربیت سے مکمل دلچسپی۔

فرائض کا جدول (ایضاً' ص ۱۶۰)

پہلا درجہ نصیر / انصار	خاص و عام اجتماعات میں شرکت' زکوٰۃ کی رقم جماعت کے حوالے کرنا' دعاؤں کا ورد کرنا' قرآن کے ایک متعین حصے کی تلاوت کرنا' نوافل و سنن کی نگہداشت' نماز چاشت اور تہجد کی عادت۔
دوسرا درجہ مجاہد	اس درجے کی خصوصیات و اوصاف کے تمام تقاضے' معروف میں مکمل اطاعت۔
تیسرا درجہ نقیب	اطاعت کے لیے اس قیادت کے ہاتھ پر بیعت جو شورائی نظام سے ابھرے۔ کسی فرد کے بجائے پوری جماعت کی طرف آنے کی دعوت۔
چوتھا درجہ نائب	جماعت کے اصولوں کی روشنی میں شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں پر صاد کرنا اور انھیں برضا و رغبت تسلیم کرنا۔

الاخوان المسلمون نے ان تینوں درجات یا مراحل کے علمی و ثقافتی معیار کے تعین' اوصاف و خصوصیات کی نشان دہی اور فرائض و شرائط کی تکمیل کے تعین کے ساتھ ایسے حلقوں اور سرکلوں کی تشکیل کا بھی اہتمام کیا جن کی صحبت میں ہر درجے کا کارکن مطلوبہ اوصاف پیدا کر سکے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں سہولت محسوس کر سکے۔ یعنی تربیت و تزکیے کے ذریعے وہ زمین' ماحول اور فضا میسر آجائے جس کی موجودگی میں دعوت دین کا بار گراں بہ سہولت اٹھایا جا سکے۔ ان تینوں درجات کے مختلف حلقوں کی تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل جدول دیکھیے :

حلقوں کا جدول (ایضاً' ص ۱۶۱)

پہلا درجہ نصیر / انصار	یہ ممکن ہے کہ ایک حلقے میں پروفیسر سعید حویٰ کی کتاب 'من اجل خطوط الیٰ الامام' مکمل ہو جائے اور خصوصیات و اوصاف اور فرائض کا مطالعہ کرنے اور ان کا پابند بننے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر ممکن ہو اس درجے کے علمی و ثقافتی لٹریچر کی ہر کتاب کا مطالعہ حلقہ بنا کر کیا جائے۔
دوسرا درجہ مجاہد	۱۔ روحانی حلقہ' ۲۔ جذبات و احساسات کو تحریک دینے والا حلقہ' ۳۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عادت ڈالنے کے لیے حلقہ' ۴۔ ورزش اور جسمانی تربیت کا حلقہ۔
تیسرا درجہ نقیب	ایک حلقہ ہو جس میں حلقوں' محفلوں' خاندانی و گھریلو نشستوں اور اجتماعات اور تحریکی نشستوں کے انتظامات پر گفتگو ہو۔ اس حلقے میں پروفیسر سعید حویٰ کی کتاب' المدخل الیٰ دعوۃ الاخوان المسلمین کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔
چوتھا درجہ نائب	ایسے حلقے کا اہتمام جس میں نائبین کے فرائض کی انجام دہی کی صلاحیت اور استطاعت پیدا ہو سکے اور اس حلقے کا انتظام بھی نائبین ہی کا شعبہ کرے۔

مفید رہے گی۔

۷۔ تیسرا درجہ ہی صف اول اور تنظیم کے درمیان واسطہ فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح براہ راست کام کرنے والے افراد کی ٹیم بھی یہیں سے فراہم ہوتی ہے۔

۸۔ چوتھا درجہ مکمل وراثت کا درجہ ہے۔ یہاں کوئی حد بندی نہیں ہے۔ اسے تمام خصوصیات کا جامع اور فرائض کا نگہبان ہونا چاہیے۔ وہ تنظیم پر عقابی نگاہ رکھتا ہو تاکہ دھڑے بندی اور اندرونی تفرقے سے جماعت محفوظ رہے۔ (ایضاً، ص ۱۴۲-۱۴۳)

الاخوان المسلمون کے اس تربیتی نظام نے تحریک اسلامی کے ایسے کارکنوں کی پرورش کی جو رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کی مکمل تصویر تھے۔ شیخ حسن البناؒ ہفتہ وار اجتماع یوم الثلاثا میں گفتگو کا آغاز محبت و اخوت کے رشتے میں منسلک ہونے اور یک جان دو قالب بن جانے کے ترغیبی کلمات سے کرتے اور اسے وہ محبت یوم الثلاثا کا نام دیتے تھے۔ اخوانیوں کے باہمی تعلقات میں اس گرم جوشی اور وارفتگی کو دیکھ کر کسی صحافی نے تبصرہ کیا تھا:

یہ وہ جماعت ہے جس کے کسی کارکن کو اسکندریہ میں چھینک آ جائے تو اسوان سے یرحمک اللّٰہ کی صدائیں سنی جاتی ہیں۔ (علامہ یوسف القرضاوی، التربیۃ الاسلامیہ و مدرسۃ حسن البنا، حوالہ بالا، ص ۱۴۳)

۱۹۴۸ میں فلسطین میں یہودیوں کے خلاف مسلح جدوجہد اور جنگ میں اخوانی دستوں نے جو محیرالعقول کارنامے انجام دیے وہ اسی نظام تربیت کا ثمرہ تھا۔ طنطا کے ایک اخوانی عبدالوہاب البتانونی کو جہاد کا شوق دامن گیر ہوا تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ جذب و شوق کی اس مستی کی راہ میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ماں جو باپ کی موت کے بعد اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی اور اس کی جدائی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی، دوسری رکاوٹ اس کی کم سنی تھی کہ ہائی اسکول کے طلبہ کو جہاد پر جانے کی اخوان نے اجازت نہ دی تھی۔ عبدالوہاب کے شدید اضطراب اور نشہ جہاد کے سامنے اخوان کے ذمہ داران نے گھٹنے ٹیک دیے۔ وہ اس کی بوڑھی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جہاد کی فضیلت اور مجاہدین کے مقام و مرتبہ پر ان سے طویل گفتگو کی۔ مسلم سورماؤں کے قصے سنائے اور ان کی ماؤں کے صبر و ضبط کے واقعات اور نمونے دل نشین انداز میں بیان کیے۔ یہاں تک کہ بوڑھی ماں نے پیار کے آنسو بہاتے ہوئے اسے جہاد میں شرکت کی اجازت دے دی۔ پھر علامہ یوسف القرضاوی، احمد عسال اور محمد طنطاوی، طنطا سے قاہرہ پہنچے اور مرشد عام کی خدمت میں ساری روداد کہہ سنائی اور اسے جہاد میں شرکت کی اجازت دینے پر مصر رہے۔ تاآنکہ شیخ حسن البناؒ نے منظوری دے دی۔ جہاد میں عبدالوہاب البتانونی شریک ہوا۔ اس نے ہتھیاروں کے ایک یہودی ذخیرہ کو

ڈائنامیٹ سے اڑایا اور اس آپریشن میں خود بھی شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ (ایضاً' ص ۷۳)

استاذ کامل الشریف نے جہاد فلسطین کے بڑے عبرت آموز واقعات بیان کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان مجاہد عبدالحمید خطاب کی ڈیوٹی معرکہ دیر العلم میں یہ لگائی گئی کہ وہ فوجی کیمپ کی حفاظت کرے اور میدان جنگ سے دور رہے۔ یہ سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا' شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ پیہم اصرار کرتا رہا کہ معرکے میں شامل ہونے کی اسے اجازت دی جائے۔ مجبور ہو کر اسے اجازت دے دی گئی۔ اس کی تمنا بر آئی اور شہادت کی خلعت زریں اسے نصیب ہوئی۔ (ایضاً' ص ۷۶)

علامہ یوسف القرضاوی کا بیان ہے کہ اخوانی مجاہدین غسل کر کے اور وضو بنا کر میدان کارزار میں جاتے' دلوں میں ایمان کی گرمی ہوتی' جیبوں میں قرآن پاک کا نسخہ ہوتا اور ہاتھوں میں بندوقیں اور توپیں ہوتیں۔ ان میں سے کسی کو گولی لگتی تو وہ اللہ اکبر کہتا' کلمہ شہادت ادا کرتا اور پکار اٹھتا:

عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (طٰہٰ ۲۰: ۸۴)

اے میرے رب' میں تیری بارگاہ میں جلدی پہنچ آیا تاکہ تو خوش ہو جائے۔

کسی اخوانی کی پنڈلی پر توپ کے کچھ ذرات پڑے اور پنڈلی کٹ گئی۔ اس کے ساتھی رونے لگے۔ اس کا اپنا حال یہ تھا کہ وہ مطمئن اور فرحاں و شاداں اپنی کٹی ہوئی پنڈلی کو دیکھ رہا تھا اور صحابی خبیبؓ کا شعر اس کی زبان پر تھا۔

ولست ابالی حین اقتل مسلماً على اى جنب كان فى الله مصرع

وذالک فى ذات الالٰه وان يشاء يبارک على اوصال شلو ممزع

(مجھے کوئی پروا نہیں اگر میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں' کہ اللہ کی راہ میں مجھے کس پہلو پچھاڑا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں ہے اگر وہ چاہے تو ان ٹکڑے ٹکڑے اعضا میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے!)۔ (ایضاً' ص ۷۷)

اس بحث کے آخر میں بطور خلاصہ دو باتیں گوش گزار کرنا ضروری ہیں:

۱۔ تحریکات اسلامی نے اپنی اپنی ضروریات و وسائل کے مطابق اپنا تربیتی نظام تشکیل دیا جس سے اسلام کے فریفتہ' اقامت دین کے شیدائی اور دفاع شریعت و وطن کے عاشق نوجوان تربیت پا کر نکلے اور دور جدید میں اسلامی نظام کی ترجمانی کی اور اپنا خون دے کر شجر دین کی آبیاری کی۔ مگر یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہونی چاہیے کہ جب تحریکیں عروج کے دور میں داخل ہوتی ہیں' ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے تو مال و زر کے بندے' دنیا طلب انسان اور خام عناصر بھی اس میں داخل ہو جاتے ہیں جو زبان سے تو اقرار

کرتے ہیں لیکن ان کے دل ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے (ایضاً، ص ۱۷۰)۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان تحریکوں کے تمام افراد مطلوبہ معیار تربیت پر پورا اترتے تھے۔

۲- تحریکات کے تجربوں سے واضح ہوتا ہے اور اسلامی تحریکوں کا سبق بھی یہی ہے کہ ایمان کے صحیح معنی قلب میں بیٹھ جائیں اور منزل واضح و روشن ہو تو ہر آن پرامن جدوجہد اور کفوا ایدیکم (النساء ۴: ۷۷)، "اپنے ہاتھوں کو روک رکھو" کی تعلیم و تلقین کے باوجود، وقت آنے پر یہ ایمان، خدا کے اذن سے پیچھے نہ رہے گا۔ اور ایمان کے معنی محدود ہوں یا منزل کا شعور نہ ہو تو لاکھوں کا مجمع بھی کلمے کے ورد کے باوجود، جہاد و شہادت کے فضائل سننے اور پڑھنے کے باوجود، ان مراحل سے آشنا نہ ہو گا (خرم مراد، خم زندگی، البدر کے آخر میں شامل مضمون، ص ۳۴۴)۔ اصل بحران فکر اور عقیدے کا بحران ہے۔ فکر و نظر میں کجی اور قرآن و سنت سے براہ راست رہنمائی حاصل نہ کرنا، اصل بیماری ہے جس میں آج مسلم امت مبتلا ہے۔ اس بحران سے ملت اسلامیہ کو نکالنا تحریک اسلامی کی ذمہ داری ہے۔ (یہ مقالہ تربیت، دعوت، خدمت کے موضوع پر ہونے والی ایک کارگاہ ورکشاپ (۸-۱۴ جون ۱۹۹۸) دہرہ دون، اترپردیش میں پڑھا گیا)

---

2 سنیے! کیا آپ سن سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو کان دیے ہیں تاکہ وہ سنے۔ عملاً 'سننا' بولنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اور اچھی طرح 'سننا' تو خاصا مشکل کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کی بات اچھی طرح سن کر ہی اپنی بات اِن کو زیادہ اچھی طرح سمجھائی جا سکتی ہے۔ جو سنتا ہے اس کو سنا بھی جاتا ہے۔

سننا مشکل اس لیے ہے کہ

☆ ہم خاموش ہوتے ہیں تو اپنے اندر محو ہو جاتے ہیں۔

☆ سنانے والے کا ایک تاثر بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تاثر ہر بات کو مخصوص پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔

☆ سنانے والے کی بات شور و غل اور رکاوٹوں سے گزرتی ہوئی بعض اوقات نامکمل صورت میں پہنچتی ہے۔

سننے کی صلاحیت کو کوشش کے ذریعہ بہتر بنایا جا سکتا ہے

جب سنیں تو ساتھ ہی ساتھ جلدی میں اور فوراً ہی' اچھے یا برے کا فیصلہ نہ کریں' بلکہ پوری بات مکمل ہونے کے بعد سوچیں ◎

سنتے ہوئے اپنے آپ کو سنانے والے کی جگہ رکھ کر اس کے اندر دلچسپی لیتے ہوئے سنیں ◎

سننے کے بعد' موقع ہو تو سوالات کے ذریعہ وضاحت حاصل کریں۔ اس طرح دوسرا فرد اپنی بات کے اندر ہی آپ کی بات کو پا لے گا۔ آپ کو بات کرنے کی ضرورت کم ہی پیش آئے گی ◎

آپ سنانے والے کی حوصلہ شکنی یا توہین سے پرہیز کریں ◎

پہلے کھلے کانوں کے ساتھ سنیں' جیسے آپ کا ریڈیو' انٹینا کے ذریعہ نشریات پکڑتا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ آپ سنیں اس کو اپنی زبان میں کہیں ◎

سنانے والوں کی بات میں جذبات بھی ہوتے ہیں' ان کو بات سے الگ رکھیں۔ اسی طرح' سنتے ہوئے اپنے جذبات اُمڈ آنے سے بچائیں ◎

جب آپ بات سن لیں' تو پھر جذبات کو بھی ابھرنے یا ٹھنڈا ہونے کا موقع دیں ◎

اکیسویں صدی میں

امت مسلمہ کو درپیش چیلنج

ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی

آج بیسویں صدی کے اختتام اور اگلی صدی کی آمد پر ہمیں پلٹ کر دیکھنا چاہیے کہ اس صدی کے آغاز پر کیا حالات تھے اور کیا چیلنج تھا اور ہم نے اس کا کیسے مقابلہ کیا۔ ہم اس کی روشنی میں یہ دیکھیں گے کہ اب اکیسویں صدی کی آمد پر کیا حالات ہیں اور کیا چیلنج درپیش ہے اور اس کا ہمیں کیسے مقابلہ کرنا ہے؟

بیسویں صدی کا چیلنج کیا تھا؟

آج سے سو برس پیشتر ۱۸۹۸ میں پاکستان کا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے مشرق و مغرب میں، شمال اور جنوب میں، ہر طرف یا تو یورپی طاقتیں قبضہ کر چکی تھیں یا جیسا کہ بعض عرب ممالک میں تھا، قبضے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہ صورت حال تھی کہ مراکش، الجزائر، تونس، ماریطانیا، لبنان اور شام پر فرانس، لیبیا پر اٹلی، مصر، سوڈان، عراق، فلسطین، خلیج، جنوبی یمن، ہندستان اور ملایا پر برطانیہ، انڈونیشیا پر ہالینڈ اور ترکستان پر روس کا قبضہ تھا۔ ایران پر روس کا دباؤ تھا اور ترکی پر روس، یورپ اور برطانیہ کا دباؤ تھا۔ یہ امت مسلمہ کے سیاسی زوال کی انتہا تھی۔

اس سیاسی زوال کے ساتھ فکری پسپائی بھی تھی۔ روشن خیالی کے نام پر جو فکری تحریکیں ابھری تھیں وہ بعد میں مرعوبیت کی تحریکیں کہلائیں کیونکہ، خواہ نیک نیتی ہی سے سہی، وہ سیاسی شکست کے جواز پیش کرنے کے مختلف انداز تھے۔ استعماری تہذیب کی برتری اور اپنی تہذیب کی تحقیر کے لیے مختلف فلسفے پیش کیے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی، گیلپ پاکستان، اسلام آباد کے چیئرمین ہیں۔

مجموعی طور پر امت مسلمہ میں اقتصادی بدحالی عام تھی۔ اگر زراعت پیشہ تھے تو اجناس کے سودے سستے ہو رہے تھے۔ اگر ہنرمند تھے تو انھیں یورپ کی مشینیں ازکار رفتہ یا بیکار کر رہی تھیں۔ اگر تیل اور دھاتوں کی معدنی دولت تھی تو ان کے سو سو سال کے سستے سودے ہو رہے تھے۔ استعمار کے سودی بنک' جہاز ران کمپنیاں' ریلیں اور سڑکیں' مسلمانوں کی دولت کو منتقل کر رہے تھے اور سستے مزدور یورپ کے ملکوں اور ان کے زیر اثر علاقوں میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ یہ اس وقت کی طاقت کا توازن تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ماضی میں کیا کیا سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

قومی ریاستیں ابھر رہی تھیں۔ جرمنی اور اٹلی تشکیل پا رہے تھے۔ برطانیہ اور فرانس کے علاوہ امریکہ اور روس دنیا کے نقشے پر اہم ریاستوں کے طور پر مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ قومی معیشت اور قومی ثقافت کا تصور فروغ پا رہا تھا۔ ایک اہم چیز یہ تھی کہ قومی ریاست کے فروغ کے ساتھ ساتھ حکومت کا ادارہ اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔ تعلیم' معیشت' ابلاغ اور سماجی زندگی کے وہ شعبے جو کبھی گاؤں اور محلے' دینی رہنماؤں' قبیلے اور برادری کی دسترس میں ہوتے تھے' ان سے نکل کر حکومت کی دسترس میں داخل ہو رہے تھے --- اور حکومت استعمار کی تھی۔

بیسویں صدی کا بیشتر حصہ ان رجحانات کے فروغ اور استحکام میں گزرا۔ سیاسی طور پر قومی ریاستیں مستحکم ہو گئیں اور پرانی سلطنتوں کی کوکھ سے نئے ملک وجود میں آگئے۔ وسیع تر تہذیبوں کے بجائے قومی تہذیب و ثقافت پروان چڑھانے کی روش رہی۔

آج جب بیسویں صدی ڈھل رہی ہے اور اکیسویں صدی کی آمد ہے تو صورت حال کیا ہے؟ اپنے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں دیکھیے' مسلمانوں کے قدم آگے بڑھے ہیں۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک مسلمانوں نے اس صدی میں آزادی کی جنگیں لڑ کر اپنی آزادی حاصل کی ہے۔ غلامی کے چند نشان باقی ہیں' وہ کشمیر میں ہوں' فلسطین میں یا کوسووا میں۔ اور وہاں سے بھی استعمار مٹ جائے گا' ان شاء اللہ! یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے۔

فکری پسپائی ختم ہو چکی ہے۔ ایک نئی اٹھان اور ولولہ ہے۔ گو حالات کی پس ماندگی ضرور ہے لیکن فکری پسپائی بہرحال ختم ہو چکی ہے۔ قومی ریاست کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر اس صدی میں ہر جگہ مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کو اسلام کا تابع بنانے کی ضرورت کو زیادہ شدت سے محسوس کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی جماعتیں بنائی ہیں۔ گو معاشی لحاظ سے بہت خوش حالی نہیں لیکن بدحالی اور تنزل کا وہ عالم بھی نہیں جو سو سال پیش تر تھا۔

میرے خیال میں بیسویں صدی میں امت مسلمہ کے قدم آگے بڑھنے میں دو تصورات کا کردار سب

سے اہم ہے۔ اول' یہ شعور کہ مسلمانوں کو غیر مسلم استعمار سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ چنانچہ جنگ آزادی کو ایک اسلامی فریضہ تصور کیا گیا۔ دوم' یہ شعور کہ اس صدی میں قومی حکومتیں انسانی زندگی میں اتنی دخیل ہیں کہ انھیں اسلام کے تابع کیے بغیر معاشرتی زندگی میں اسلام کا نفاذ انتہائی محال ہے۔

سوال یہ ہے کہ درحقیقت اکیسویں صدی کا چیلنج کیا ہے؟ یہ چیلنج متعین کرنے کے لیے دیکھنا چاہیے کہ آج دنیا میں کیا بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پہلی تبدیلی یہ ہے کہ دنیا سمٹ رہی ہے۔ ذرائع نقل و حمل اور رسل و رسائل میں انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ کمپیوٹر اور سیٹلائیٹ نے زندگی جس طرح سمیٹ کر رکھ دی ہے' اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری تبدیلی یہ ہے کہ قومی ریاست یا عام معنوں میں حکومت کے اختیارات میں کمی ہو رہی ہے۔ تعلیم' معیشت اور ذرائع ابلاغ کا خاصا بڑا حصہ' حکومتوں کے علاوہ کچھ نئے اداروں کے اثر و رسوخ میں جا رہا ہے۔ ان میں سے بعض ادارے ملکوں سے بالا یعنی عالم گیر سطح پر اور بعض بالکل ہی مقامی اور چھوٹی سطح پر ہیں۔

امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ ان حالات میں اپنے راستے کا تعین کرے۔ آج جو چیلنج درپیش ہیں' ان کو تین طرح کے چیلنج کہا جا سکتا ہے:

۱- **حالات کی تبدیلی کا چیلنج:** دنیا سمٹ گئی ہے۔ مسلمانوں کی بین الاقوامی تنظیم کی ضرورت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔ قومی حکومتوں کے دائرہ کار اور دائرہ اثر میں کمی ہو رہی ہے۔ ایسے ادارے بن رہے ہیں کہ جن میں سے بعض قومی ریاست سے بالا اور بعض اس کے تحت مقامی سطح پر ہیں۔ ان کے ادراک اور ان کے اندر موثر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس میں بین الاقوامی ادارے بھی شامل ہیں اور بالکل مقامی طور پر تعلیم' صحت' سماجی بہبود اور بلدیاتی نظم و نسق کے ادارے بھی۔

۲- **ارتقا کا چیلنج:** مسلمان ملک کل غلام تھے' آج آزاد ہیں۔ اسلامی تحریکیں کبھی بے سروسامانی کی حالت میں قائم کی گئی تھیں' آج الحمدللہ دنیا کے گوشے گوشے میں کثیرالتعداد عوامی جماعتیں ہیں۔ ان تبدیلیوں کے مطابق لائحہ عمل اور تنظیم کے ارتقا کی ضرورت ہے۔ بعض صورتوں میں یہ ارتقا جمود کا شکار ہے۔ تنظیم کی زندگی کے لیے ثبات اور تغیر دونوں کی اہمیت کے لحاظ سے' کچھ چیزیں مستقل اور بعض تبدیل ہوتی رہنی چاہییں۔ ثبات و تغیر کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیسے ارتقا ہو' یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

۳- **فکری و تہذیبی انارکی کا چیلنج:** گو کہ دنیا سمٹ کر ایک ہو رہی ہے لیکن اس نئی اکائی کو منظم کرنے کے لیے نہ کوئی "فکر" ابھری ہے' نہ کوئی ایسی قوت جو اپنی اخلاقی برتری کے سبب قیادت کی اہل تسلیم کر لی جائے۔

ابھی تک جو نقشہ ابھرا ہے اس میں چند معاملات پر عالم گیر گرفت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس میں ا-

انسانی حقوق کا تحفظ' ۲- تجارت اور مالی معاملات کی تنظیم' ۳- دہشت گردی کا تدارک' ۴- منشیات کی تجارت کی روک تھام' ۵- ماحول کی آلودگی سے بچاؤ' سرفہرست ہیں۔ لیکن ان عالم گیر تصورات کو کامیابی اور مقبولیت نصیب نہیں ہو رہی کیونکہ اولاً ان کے پیچھے کوئی اخلاقی فکر نہیں جو انسانوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ دوسرے یہ کہ ان عالم گیر تصورات کے موید اور ترویج دینے والے لوگ خود شدید نفاق کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ وہ جو کہتے ہیں' کرتے نہیں۔ مثلاً آزاد عالم گیر تجارت کا موید ہونے کے باوجود خود امریکہ اور یورپ آزاد تجارت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ پاکستانی کپاس ہی کو دیکھ لیں کہ وہ کوٹے کے بغیر ان ملکوں میں نہیں جا سکتی۔

انسانی حقوق کے تحفظ کے نعرے اپنے قومی مفادات کے حصول کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں اور جب اپنے قومی مفاد میں ہوا' اسے استعمال کر لیا اور جب چاہا ترک کر دیا۔ کبھی چین کے خلاف' کبھی ایران اور عراق کے خلاف' مگر کشمیر میں اجتناب۔

سب سے زیادہ منظم دہشت گرد اور جرائم پیشہ گروہ انھی ممالک میں پروان چڑھتے ہیں جو ان پر گرفت کے دعوے دار ہیں۔ ان کے طرز زندگی اور معیشت میں وہ عناصر شامل ہیں جو انھیں فروغ دیتے ہیں۔ اس طرز زندگی میں جوا' شراب' فحاشی اور تشدد کی موجودگی میں بین الاقوامی دہشت گردی کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ اس اصل دہشت گردی کو بھول کر ان لوگوں کو دہشت گرد کہنا جن کی راتیں عبادت میں اور دن فساد کے خلاف جہاد میں گزرتے ہیں' نفاق کی نشانی ہے۔ منشیات کی تجارت کو روکنے کا دعویٰ کرنے والے سب سے مہلک نشہ آور شے یعنی شراب کو قانونی تحفظ دے کر اسے فروغ دیتے ہیں۔ شراب نہ پینے والوں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

ماحول کی آلودگی کا رونا رونے والوں کا یہ حال ہے کہ ایک حالیہ مطالعے کے مطابق یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنی زندگی میں دنیا کے اہم ذخائر یعنی تیل' پانی' جنگلات وغیرہ کو غریب ملک میں پیدا ہونے والے بچے سے ۲۵ گنا زیادہ استعمال کرتا ہے۔ یعنی اس کرہ ارض کے وسائل پر ۲۵ گنا زیادہ بوجھ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد ماحول کی آلودگی کے طعنوں کا رخ غریبوں پر کرنا' دوغلا پن نہیں تو اور کیا ہے۔

میرے اس نکتے کا خلاصہ یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے' اور دنیا کی ایک اکائی بنتے ہوئے ایسی فکر' قیادت اور لائحہ عمل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس کے مشترکہ مسائل کو حل کرے' جسے اخلاقی قبولیت نصیب ہو سکے اور اسے انصاف کے ساتھ رائج کرنے کا اہتمام ہو۔

یہ بات کچھ عجیب سی لگ سکتی ہے کہ اس کھلے آسمان کے نیچے' مسجد کے فرش اور گھاس پھوس پر بیٹھے ہوئے یہ مرد و زن' ان عالم گیر مسائل کا ادراک کریں اور ان کے حل کی قیادت کا خواب دیکھیں جو آج کے

قیصرو کسریٰ کی دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن خدا کی قسم! یہی ہماری تاریخ ہے۔ اللہ کی قدرت تھی کہ اس نے عرب کے بے آب و گیاہ ریگستان میں ایک یتیم بچے پر اپنی وہ ہدایت نازل کی جس سے دنیا کا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ سید مودودیؒ تفہیم القرآن میں سورۃ الروم کی تفسیر لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ جب غلبہ روم کی وحی نازل ہوئی تو کفار مکہ نے ٹھٹھا کیا کہ جن کے تن پر کپڑے نہیں' یہ روم کے خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن ہدایت کا یہ سرچشمہ تھا کہ جس نے ایک دن سلطنت روم کے دارالحکومت کو مسلمانوں کے شہر اسلامبول' یا معروف الفاظ میں استنبول بنا دیا' اور اس دوران دنیا بھر کے لیے عدل و انصاف' نظم و ضبط اور اخلاق کے عالم گیر اصول تشکیل دے دیے۔

میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب کے تحفظ اور فروغ کے لیے اللہ تعالیٰ کو کہیں نہ کہیں سے ہدایت دینی ہے۔۔۔ فرد کی زندگی میں نئی روح پھونکنے کے لیے' خاندانی زندگی کے تحفظ کے لیے' مال و شہوت کی ہوس کی تحدید کے لیے' خود غرضی اور نفسانفسی کے بجائے اخوت و ایثار کے طرز زندگی کے لیے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کریں تو شاید اللہ یہ فریضہ ہمیں سونپ دے۔

ممکن ہے کہ تنہا کسی ایک ملک کے مسلمانوں میں یہ صلاحیت نہ ہو لیکن نئی ٹکنالوجی اور عالم گیریت (globalization) کا چرچا ہے۔ اس میں آج یہ جوہر موجود ہے کہ عالم اسلام کے نیک اور اہل لوگ مل جل کر اس فریضے کو سرانجام دینے کی صلاحیت حاصل کر لیں۔ عین ممکن ہے کہ اکیسویں صدی اور اس کی عالم گیریت کے ہتھیار زیر ہو کر عالم گیر امت مسلمہ کی تشکیل کا وسیلہ بن جائیں۔

تاریخ کا سبق ہے کہ تہذیبیں وہی عالم گیر بنتی ہیں جو اپنے محدود مسائل کے بجائے عالم انسانیت کے مسائل کو حل کرنے نکلتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو ان کی اپنی مخصوص تہذیب ہی سب کا مرجع بن جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں ہم نے اپنی آزادی کی جنگیں لڑیں۔ شاید اللہ نے یہ مقدر کیا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہم اس نئی عالم گیر تہذیب کے صحت مند فروغ اور انسانی تہذیب کے تحفظ کی لڑائی لڑیں گے۔ بیسویں صدی میں ہم نے مسلمانوں کی ریاستوں میں سیاسی تنظیم کی' سیاسی جماعتیں بنائیں' اکیسویں صدی میں ہم عالم اسلام اور عالم انسانیت پر محیط وہ تنظیمیں بنائیں گے کہ جو دنیا بھر کے مسلمانوں اور نیک فطرت انسانوں کے ذریعے انسانی تہذیب کو مثبت سمت دیں گی۔

ان حالات میں' جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے روز مرہ مسائل اور کل کی فکر کریں وہاں یہ بھی انتہائی اہم ہے کہ:

اول' ہم نظر کو وسیع کریں' سال دو سال کی نہیں' پچاس سال کی سوچیں اور اکیسویں صدی کے نصف

تک پہنچنے کا لائحہ عمل بنائیں۔ یہ بہت طویل مدت نہیں۔ ہم میں سے کئی ایسے ہیں کہ جنھیں اپنی زندگی کی نصف صدی کا لمحہ لمحہ یاد ہے۔

دوم' تمام عالم کو اپنا میدان عمل بنائیں۔

سوم' تمام انسانوں کو اپنا مخاطب سمجھیں۔

یہ تینوں کام ایسے ہیں کہ مسلمان کی فطرت میں ان کا جوہر موجود ہے۔ بس اہلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ تحریکات اسلامی اور دیگر سلیم الفطرت تنظیموں کو یہ توفیق دے کہ وہ عامتہ الناس میں یہ اہلیت پیدا کرنے میں معاون ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اکیسویں صدی میں یہ دنیا بدل سکتی ہے۔

اس سلسلے میں کچھ امور اجتماعی طور پر تنظیموں کے لیے' اور کچھ انفرادی طور پر افراد کے غور کے لیے پیش ہیں:

تنظیمی چیلنج

۱۔ امت مسلمہ میں ہر جگہ مسلمانوں کو اپنی بلدیاتی تنظیم یا لوکل گورنمنٹ کو موثر بنا کر اس میں کلیدی کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ اس آبادی کے تمام مکینوں کے مشترکہ مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ یہ بلدیاتی دائرہ بالعموم بہت مختصر ہو گا۔ پاکستان جیسے بڑے ملک میں بھی بلدیاتی وارڈ کی سطح پر جب مردم شماری ہوئی تو ایک وارڈ کی آبادی اوسطاً صرف دو سو گھروں پر مشتمل ہے۔ ملک میں اس طرح کے صرف ایک لاکھ وارڈ ہیں۔

۲۔ اسلامی تنظیموں کو ایسے قائدین تیار کرنے کی نرسری بننا چاہیے جس میں تربیت پا کر یہ افراد اپنی ذات میں ایک انجمن ہوں۔ اس عمل کو روایتی تنظیم سازی پر ترجیح دی جائے۔ اگر پاکستان کے ایک لاکھ وارڈ میں اس طرح کے قائدین موجود ہوں تو شاید اس ملک کی تقدیر بدل جائے۔ یہی مثال دیگر مسلم ممالک پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

۳۔ اپنے مقامی دائرے میں' بستی' برادری اور خاندان کے محور میں تعلیم' علاج' سماجی بہبود اور انصاف کے ایسے آزاد ادارے بنائے جائیں جو قومی حکومتوں کی محتاجی کے بغیر آزاد معاشرے کو مستحکم کر سکیں۔ میری نظر میں' اکیسویں صدی میں' استعمار کے جارحانہ عزائم کے خلاف سب سے بڑی ڈھال یہی مقامی ادارے ہوں گے۔

۴۔ مسلمان علما' ماہرین' اہل دانش اور کاروباری لوگوں کو چاہیے کہ وہ نئی عالم گیر ٹکنالوجی کے بھرپور استعمال سے اپنے عالم گیر روابط تشکیل دیں تاکہ امت مسلمہ کی عالم گیر کوششوں سے عالم انسانیت کے مسائل کے حل کی جانب پیش رفت ہو۔

انفرادی چیلنج

۱- اگر آپ نوجوان ہیں تو علم حاصل کریں کہ اکیسویں صدی میں علم و ہنر کی بڑی اہمیت ہے' اس سے کہیں زیادہ جتنی بیسویں صدی میں تھی۔ اپنے پیشے کے ہنرمند بنیں۔ یہی چیز آپ کو اپنے معاشرے میں توجہ کا مرکز اور مرجع بنائے گی۔

۲- اگر آپ پیشہ ورانہ تعلیم سے آراستہ ہیں' تو یاد رکھیے کہ آپ کو صرف پاکستان ہی میں نہیں' دنیا میں نام پیدا کرنا ہے۔

۳- اگر آپ تنظیم سے وابستہ ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ کی تنظیم برائے تنظیم نہیں ہے' بلکہ اپنی اور معاشرے کی اصلاح کے لیے ہے۔

۴- اگر آپ تنظیم میں قیادت کے مرتبے پر فائز ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ کی قیادت بڑی ادھوری ہے' جب تک آپ اپنی آبادی کی توجہ کا مرکز یا مرجع نہیں بنتے۔ صرف اپنی ہی تنظیم کا قائد ہونا کافی نہیں۔

اگر آپ اپنی اپنی بستی اور اپنے اپنے پیشے میں اہلیت' امانت اور انصاف کا نشان بن جائیں تو معاشرے کا مرجع ان شاء اللہ ضرور ہوں گے۔

اگر آپ تنظیم کی سمت کا تعین کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ بار عظیم بھی ڈالا ہے کہ آپ کی ترجیحات محض آپ کی نہیں' لاکھوں اور کروڑوں نیک دل انسانوں کی ترجیحات ہیں۔ آپ کے اقدامات کو محض آج کے نہیں' اگلے پچاس سال کے نفع و نقصان کے پیمانے پر تلا جائے گا۔ آپ جس سمت کا تعین کریں گے اس کے اثرات اس ملک پر ہی نہیں' بلکہ آج کی اس سمٹی ہوئی دنیا میں عالم اسلام اور عالم گیر سطح پر ہوں گے۔ یہ نہایت اہم ذمہ داری ہے۔

یہ دنیا بدل سکتی ہے۔ آج ۱۹۹۸ ہے' صرف ۲۰ برس پیش تر ۷۹/۱۹۷۸ میں ایک ملک کا سفیر یہ کہتا تھا کہ پاکستان افغان مجاہدین کی مدد بند کر دے ورنہ اسے نیست و نابود کر دیں گے۔ اب بیس سال میں اس وقت کا سوویت یونین کم از کم ۱۵ حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

پھر بھی انسان عبرت نہیں پکڑتے!

یہ دنیا آج بھی بدل سکتی ہے۔ یہ آج بھی ایک انقلاب کی منتظر ہے!

(اجتماع عام' اسلام آباد میں پڑھا گیا' ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۸)

تعلیمی اداروں کی ثقافت: چند تاملات

عبدالقدیر سلیم

بھلا تم نے دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک پاکیزہ درخت' جس کی جڑ زمین میں مضبوطی سے پیوست ہو' اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر آن اپنے پھل دیتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے یہ مثالیں اس لیے دیتا ہے کہ وہ ان سے سبق لیں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدنہاد درخت کی سی ہے' جسے زمین پر سے اکھاڑ دیا گیا ہو' اس کے لیے کوئی جائے قرار نہیں۔ (ابراھیم ۱۴: ۲۴-۲۶)

انسانی معاشرے کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے' ایک تو یہ کہ یہ ایک زندہ جسم' ایک عضویہ ہے' نمو پذیر یا زوال آمادہ۔ یہ چند انسانوں کے میل جول سے جنم لیتا ہے' پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے' بڑھتا اور سنورتا ہے' اور یا پھر ان میں انتشار اور منافقتوں کے نتیجے میں انحطاط کا شکار ہو کر بکھرنے لگتا ہے' اور اس کے خلیے (افراد) منتشر ہونے لگتے ہیں' ان کا باہمی ربط ختم ہونے لگتا ہے' جس سے اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

معاشرے کی دوسری صورت گری (حالیہ) یوں کی گئی ہے کہ یہ دراصل انسانوں کے درمیان ایک رشتوں کے تانے بانے (total network) یا جال کا نام ہے' اور اس طرح معاشرے کے اجزا' افراد کا نہیں' بلکہ ان کے درمیان علائق (رشتوں) سے وجود میں آتے ہیں۔ افراد' اس تانے بانے کے محض مراکز (foci) ہوتے ہیں۔

ثقافت اور اس کے مفہوم و مظاہر پر بہت گفتگو ہو چکی ہے۔ مگر میں اپنی معروضات پیش کرنے سے پہلے اس کی ایک تعریف کو سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا' تاکہ اگلی گزارشات کو اس کی روشنی میں دیکھنے کی

پروفیسر عبدالقدیر سلیم' انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن' کراچی' میں وزٹنگ پروفیسر ہیں۔

کوشش کی جا سکے۔ میرے خیال میں کسی قوم یا اجتماع کی ثقافت اس کے افراد کے کردار یا طرز عمل کی یکسانیتوں پر مشتمل ہوتی ہے، جن کی عکاسی ان کے درمیان پائے جانے والے علائق سے ہوتی ہے۔ پھر یہ یکسانیتیں خارجی بھی ہوتی ہیں، اور داخلی بھی اور یہی یکسانیتیں، اس قوم یا معاشرے یا گروہ کو دوسری اقوام، معاشروں اور گروہوں سے متمیز کرتی ہیں۔ تاہم افراد کے درمیان وہ یکسانیتیں، جو ان کی حیاتیاتی اور طبعی اوصاف کو ظاہر کرتی ہیں، انھیں ثقافت کا حصہ تصور نہیں کیا جا سکتا، جیسے کسی علاقے کے لوگوں کا رنگ، قد کاٹھ اور ناک نقشہ ان کی ثقافت کا حصہ نہیں ہیں۔

اس تعریف میں کردار کی جن خارجی یکسانیتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا تعلق رہن سہن، خورد و نوش، لباس و زیبائش اور اس طرح کے دوسرے خارجی مظاہر سے ہے، جب کہ داخلی یکسانیتوں میں ہم ایک گروہ کے مخصوص "نظام اقدار" کو شامل کر سکتے ہیں۔ میں گمان کرتا ہوں کہ کسی قوم یا گروہ کے مخصوص عقائد، ایمانیات، امنگیں اور آرزوئیں، پسند و ناپسند، رد و قبول کے معیارات بھی اس کی مخصوص ثقافت کا ویسا ہی، بلکہ زیادہ عمیق اور وزنی (profound) جزو ہیں، جیسا کہ اس کے ظروف اور آداب طعام و لباس۔ کیوں کہ یہ داخلی رجحانات ہی دراصل اس کے خارجی میلانات کو متعین کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف طبعی اور جغرافیائی احوال و ظروف میں ان کے اظہارات میں اختلافات اور بوقلمونی نظر آتی ہو۔

اس وقت پاکستان میں بالفعل تین چار طرح کے نظام تعلیم مروج ہیں، اور ان کے ذیل میں چھ سات قسم کے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ کراچی کے امریکن اور گرامر اسکول جیسے اداروں کا نصاب اور نظام تعلیم کلیتاً بدیسی ہے، اور اس کا پاکستانیت یا اسلام کے ساتھ کسی طرح کوئی بھی رشتہ نہیں۔ پھر دوسرے درجے میں نہایت گراں انگریزی میڈیم اسکول ہیں، جو طلبہ کو "او لیول" اور "اے لیول" کے لیے پڑھاتے ہیں۔ پھر محلوں میں گلی گلی، تیسرے اور چوتھے درجے کے نام نہاد انگلش میڈیم اسکول ہیں۔ پھر سرکاری (پیلے) اسکول ہیں (عموماً اردو میڈیم یا مقامی زبانوں میں تعلیم دینے والے)۔ تعلیمی اداروں کا ایک سلسلہ پبلک اسکولوں کا بھی ہے (نیم سرکاری) جنھیں سرکاری امداد بھی ملتی ہے، لیکن عموماً مراعات یافتہ طبقے ہی کی ان تک رسائی ہے، اور کم ہی دوسرے بچے وہاں تک پہنچ پاتے ہیں۔ ایک سلسلہ عیسائی مشنری اسکولوں کا بھی ہے، ان کے بھی مختلف طبقات اور درجے ہیں، غریب بستیوں میں ان کے اسکول کوئی خاص معیاری نہیں، جب کہ امرا کی اولاد کے لیے گراں اور بہتر معیار کے اسکول قائم کیے گئے ہیں۔ پھر ایک سلسلہ تعلیم دینی مدارس کا ہے۔ ان کے بھی کئی درجات اور الوان ہیں۔ دور افتادہ گاؤں اور پس ماندہ علاقوں میں نہایت قلیل وسائل سے کام کرنے والے مدارس، اور بڑے شہروں میں بڑے بڑے اور باوسیلہ مدارس ہیں۔ ان مدارس میں بھی مختلف فقہی مکاتب اور مسالک کے الگ الگ رنگ ہیں۔ ان سب اداروں کا اپنا اپنا کلچر ہے، اور پھر ہماری ثقافت کے

متغیراور متلون رنگوں نے بھی ہمارے مدارس پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور اس کی عکاسی ہر جگہ نظر آتی ہے مگر ایسا کیوں ہے؟

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تعلیمی پالیسی مرتب کرنے والے یا کم از کم اس پر اثرانداز ہونے والے عمومی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: اولاً برسر اقتدار آنے والے وہ حکمراں (سیاست داں) ہیں جو تعلیم کی حرکیات کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے' نہ ان کی صفوں اور جماعتوں میں کوئی ایسے ماہرین اور دانش ور ہی موجود ہیں' جو انھیں تعلیمی اداروں کے مطلوبہ رنگ و آہنگ اور انسان سازی کے اصل اہداف اور طریقوں سے آگاہ کر سکیں' اور ان کے ذہنوں میں مطلوبہ اہداف کے حصول کی لگن پیدا کر سکیں۔ کیوں کہ ان کے اپنے کوئی مراجع فکر (think tank) ہیں ہی نہیں' نہ انھیں ان کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ تعلیم' اور خصوصاً ابتدائی تعلیم کے ادارے اور مدارس ان کی توجہ اور ترجیحات میں بہت ہی نیچے مقام رکھتے ہیں۔ تعلیم' ان کی نظر میں بس اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے مطلوبہ تعداد میں ہنرمند اور مختلف مہارتوں کے ماہرین میسر آ جائیں۔ اس بات کو ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہماری سیاسی ہیئت مقتدرہ' تعلیم' خصوصاً ابتدائی تعلیم کو اپنی توجہ کے لائق ہی تصور نہیں کرتی' اور انسان سازی اس کے نزدیک ایک بے معنی ہدف ہے۔ اسی لیے متنوع تعلیمی اداروں کا کلچر' خود رو جنگل کی طرح اگتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔

تعلیم کی ساخت اور ہیئت کو متعین کرنے والا دوسرا گروہ' ان نام نہاد ماہرین تعلیم کا ہے' جو حکمرانوں کی فرمایش پر' ان کی خواہش کے مطابق (یا کم از کم ان کی خواہش سے غیر متصادم) اور ان کی مقرر کردہ حدود و اہداف کے مطابق وقتاً فوقتاً تعلیمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم' اس کی اہمیت' اس کی حرکیات اور ایک قوم' ایک معاشرے اور ایک خاندان کے لیے تعلیم کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج سے بالکل بے بہرہ تو نہیں ہوتے' لیکن بدقسمتی سے اب' جب کہ وہ قوم کے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے لیے خاکے اور نقشے مرتب کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں' تو خود ان کے مفادات قومی اور عوامی مفادات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے' اس لیے اس کار خیر میں دلی لگن کے ساتھ شرکت اور اس کے لیے حقیقی جذبہ یہاں مفقود ہوتا ہے۔ اور جہاں ان کے مفادات ہوتے ہیں' ان کا تحفظ کرنا وہ بہ خوبی جانتے ہیں' اور اس آگاہی اور شعور کے ساتھ ساتھ وہ اس کے تحفظ کی اہلیت و قوت بھی رکھتے ہیں۔

یہ بات تھوڑی سی تشریح طلب ہے۔ میں ماضی میں زیادہ پیچھے نہیں جاؤں گا' لیکن ۱۹۷۲' ۱۹۸۵ اور پھر ۱۹۹۲ کی تعلیمی پالیسیوں پر اس حوالے سے ایک نظر ڈالنے کی استدعا ضرور کروں گا۔ ۱۹۷۲ میں حکومت نے یہ انقلابی قدم اٹھایا تھا کہ دینی مدارس کو چھوڑ کر سارے ہی ابتدائی مدارس' کالج اور دوسرے عمومی تعلیم کے

نجی ادارے قومی تحویل میں لے لیے تھے۔ صرف چند "پبلک اسکول" اور "گراں فیس" وصول کرنے والے مدارس' مثلاً کراچی میں گرامر اسکول' امریکن اسکول' حبیب پبلک اسکول اور ملا اور بی-وی-ایس پارسی اسکول جیسے چند ادارے اس قومیانے کے عمل سے باہر رکھے گئے تھے۔ اب یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔

اگر قومیانے کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم (کم از کم ابتدائی تعلیم) کو حکومت اپنی ذمہ داری تصور کرتی تھی' اور نیت یہ تھی کہ ملک کے سبھی بچوں کو ایک معیاری تعلیم کے حصول کا موقع فراہم کیا جاتا ہے' تو مدارس کے قومیانے میں کسی طرح کا کوئی استثنیٰ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تمام مدارس کے نصاب' اساتذہ اور ماحول میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی' اور مملکت کے نظریے سے ہم آہنگ ایک قومی کلچر کی بنیاد رکھنے پر توجہ ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے کوئی دو بندے اور کوئی دو بچے بالکل ایک جیسے اور ایک صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے۔ جس طرح بچوں میں ذہانت اور صلاحیت کا فرق اور درجات' مسلمہ حقیقت ہیں' اسی طرح یہ بھی ایک سادہ حقیقت ہے کہ کوئی دو استاد بھی اپنی صلاحیت' افتادِ طبع' فطری میلان اور دلچسپی' اور نتیجتاً طلبہ کی تعلیم و رہنمائی کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے۔ قومیانے کے عمل کا فطری تقاضا تو یہ تھا کہ حتی المقدور کوشش کی جاتی کہ تمام تعلیمی ادارے بتدریج یکساں نصاب' اساتذہ اور ماحول کے ذریعے یکساں معیار کے حامل بن جائیں' تاکہ مختلف نظام ہاے تعلیم کے ذریعے جو مختلف طبقات' ثقافتیں اور مختلف درجوں کے حاکمین اور محکومین کے گروہ پیدا ہوتے ہیں' اور ان کے ذریعے جو غیر اخلاقی' ظالمانہ' استحصالی نظام کی استواری عمل میں آتی ہے' اس کا ازالہ ہو سکے۔ مگر چوں کہ یہ مقصد نہ تھا اس لیے ایسا نہ ہو سکا۔

۱۹۷۷ کے فوجی انقلاب کے بعد' جس میں اسلام اور پاکستانی ثقافت کا خاصا نام لیا گیا تھا' قومی تعلیم اور تعلیمی ثقافت میں یکسانیت پیدا کرنے کے ایک ممکنہ موقع کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے مارشل لا ضابطے ۱۱۸ کے تحت (جو تعلیمی حکمت عملی کا ضابطہ تھا)' تمام نجی مدارس اور کالج قومی تحویل میں لے لیے گئے تھے' اور اس ضابطے کی رو سے کسی فرد یا غیر سرکاری (نجی) ادارے کو مدرسہ یا کالج قائم کرنے کی اجازت نہ تھی' کہ تعلیم کو صرف حکومت ہی کا فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷ کے انقلابیوں نے یہ ضابطہ ختم تو نہیں کیا' لیکن عملاً یوں ہوا کہ تدریجاً جن انجمنوں نے اپنے ادارے واپس لینے چاہے' ان کے لیے نرم رویہ اختیار کیا گیا' اور پھر سے نجی شعبے میں تعلیمی اداروں کے اجرا کی اجازت دے دی گئی۔ اور اس کا نتیجہ اب یہ ہے کہ ملک میں مختلف الوان و اقسام کے ہزارہا مدارس اور تعلیمی ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ ۱۹۸۵ اور پھر ۱۹۹۲ کی تعلیمی پالیسیوں میں باقاعدہ طور پر تعلیم میں نجی شعبے کے وجود کو تسلیم کیا گیا' اور اس کی ہمت افزائی کی گئی۔

چوں کہ اس میں کوئی قدغن (عملاً) نہیں ہے کہ نجی شعبوں میں قائم ہونے والے ان تعلیمی اداروں

میں کیا پڑھایا جائے گا، کون پڑھائے گا، کیا فیس لی جائے گی، ماحول کیسا ہو گا، اس لیے پورا ملک تعلیم کے شعبے میں ایک پاگل خانہ بن چکا ہے۔ جہاں بھانت بھانت کی بولیاں اور طرح طرح کی آوازیں، کسی معقول اور باشعور معاشرے کا پتا نہیں دیتیں۔ مگر "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کے سنہرے اصول کے مطابق اس میں بھی مقتدر طبقے کی ضروریات اور مفادات کا خیال ضرور رکھا گیا ہے، اور اس کے لیے وسائل اور ذرائع (سرکاری اور نجی سطحوں پر) فراہم کرنے کا انتظام و انصرام بھی موجود ہے۔ اس طرح ملک میں تعلیمی ثقافتوں کے بے شمار رنگ پیدا ہو چکے ہیں۔

یہاں سرکاری اسکول بھی ہیں (غربا اور مساکین کے لیے) اور امرا اور طبقہ مقتدرہ کے لیے قیمتی پبلک اسکول بھی۔ "او" اور "اے" لیول والے بدیسی نصاب والے انگریزی اسکول بھی ہیں، اور دیسی اسکول بھی، اور کاروباری انداز کے مختلف درجات کے بے شمار ایسے اسکول، جو مختلف وزن کی جیب رکھنے والوں کی اولاد کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

ان سب کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں ایک تہذیبی بحران اور انتشار پیدا ہو چکا ہے اور "وحدت ملی" جس کا ذکر کرتے کرتے، علما و اساتذہ، سیاست کار اور داہنے بازو کے دانش ور، راست باز ادیب اور شاعر اور صحافی، کبھی نہیں تھکتے، ایک خواب پریشاں سے زیادہ کچھ نہیں رہی ہے۔

کعبہ، جس کی سمت، مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب ہر طرف کے مسلمان رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں، دنیا کے سب مسلمانوں کے لیے ایک مرکز وحدت فراہم کرتا ہے، اور توحید کے علامتی اظہار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مختلف خطوں، علاقوں اور ملکوں کی ثقافتیں مختلف ہو سکتی ہیں، مگر ان کے درمیان ایک باریک اور لطیف رشتہ، مذہب اسلام کا ہے۔ اس رشتے کی دریافت، اسے محکم اور مستحکم کرنا ہی ایک اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی وظیفہ ہونا چاہیے، جسے اب ہم گم کر بیٹھے ہیں۔

وہ رشتہ کیا ہے؟ مذہب، کائنات کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر اور رویے کا رشتہ، جس کی عملی صورت ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تربیت یافتہ اصحاب کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ اپنے جغرافیائی حالات، بعد زمانی و مکانی کے باعث ہمارے اور ان کے مظاہر زندگی میں بڑے فرق ہو سکتے ہیں۔ تاہم بات اس ثقافتی روح اور رویے کی ہے، جس کی عدم موجودگی میں کوئی تعلیمی نظام، اسلامی نہیں کہلا سکتا، اور میرے خیال میں کوئی معاشرہ مسلم معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ گمان بھی ہے کہ اس روح ثقافت کے بغیر، دوسری اقوام تو "ترقی" کر سکتی ہیں، جیسا کہ ہمیں مشرق بعید، یورپ اور امریکہ میں نظر آتا ہے، مگر اسے تج کر کوئی قوم، جو خود کو "مسلمان" بھی کہتی ہو کسی طرح بھی اقوام عالم میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بعض افراد انفرادی طور پر دنیاوی خوش حالی، عزت و مرتبے کے

کسی مقام پر پہنچ جائیں، لیکن منقسم شخصیت کے ساتھ کوئی قوم بھی بام عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اسلامی فکر اور نظریات پر اساس رکھنے والے مدارس اور تعلیمی اداروں میں ظاہر ہے کہ اس ثقافت کو رواج دینے کی کوشش کی جانی چاہیے، جس کا تقاضا اسلام ہم سے کرتا ہے۔ نظری طور پر اس ثقافتی روح کو طلبہ کے ذہن اور ان کی نفسیات میں جاگزیں کرنے کی ضرورت ہے، اور عملی طور پر اس کے مظاہر کو ان کی زندگیوں میں منعکس کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

لیکن آج پاکستان میں ہم اپنے بچوں کو کس طرح کے آورشوں، تمناؤں اور اہداف کا طالب اور خوگر بنانا چاہتے ہیں، یا بنا رہے ہیں، اس کے بعض نمونے مجھے حال ہی میں بعض امتحانی کاپیوں میں نظر آئے، جن میں متعدد طلبہ نے اعتراف کیا کہ ان کی ثقافت کیا ہے، اور وہ کیا بننے کے آرزومند تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک بڑا عہدہ یا منصب، جس کے ساتھ گراں قدر مشاہرہ اور بہت سی مراعات ہوں۔ رہنے کے لیے طبقہ امرا کے علاقے میں ایک وسیع، کشادہ اور خوب صورت مکان، قیمتی سواری، شان دار اور باثر شریک حیات، وسیع اختیارات اور معاشرے میں عزت کا ایسا مقام جس کی سب تمنا کریں، لیکن کم ہی وہاں تک رسائی پا سکیں۔ اب قید سے ناآشنا مسرتوں کا حصول زندگی کی غایت قرار پایا ہے۔ مسرت کا آرزومند کون نہیں، اور کسے "گلشن بے خار" میں بسنے کی خواہش نہیں؟ مگر جو چیز پریشان کر دینے والی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو مذکورہ بالا اہداف کے حصول کے لیے کوئی بھی قیمت زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ وہ انھیں ہر طریقے پر اور ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بعض اس بات پر ضرور متوحش ہیں کہ ہماری روایتی اقدار، ہمارا مذہب اور ہمارا نظام اخلاق، ہماری بعض خواہشات کی تکمیل کی راہ میں آڑے آتے ہیں۔ لیکن بہت سوں کو اس کا شعور ہی نہیں۔ خاص طور پر وہ بچے جن میں ابھی تنقیدی حس بیدار نہیں ہوئی، وہ اپنے گھریلو ماحول، مدرسے کی فضا اور ذرائع ابلاغ (خصوصاً ٹی وی) میں جس دنیا کو دیکھتے ہیں، جیسی، کوٹھیاں، کاریں، باغ، دفتر، حوریں، غلمان، لباس، خورد و نوش، تفریحات اور مشاغل اور دوسرے اسٹائل وہاں انھیں نظر آتے ہیں، انھی کے معیار پر خود کو لے جانے یا ترفع اور حرکت عمودی کے ذریعے انھیں پا لینے کی خواہش کرتے ہیں۔ جو اسے حاصل نہیں کر پاتے، سخت فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں، یا جرائم (بشمول "سفید کالر جرائم") کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اور جو نوجوان معیار زندگی کی اور مادی آسودگی کی ایک نام نہاد بلند سطح تک پہنچ چکے ہیں، وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں، میں نے بعض بچیوں سے ایک وضاحت بطور جواب چاہی: میں پردہ کیوں نہیں کرتی؟ ان

میں سے شاید ہی کسی نے یہ جواب دیا کہ بے حجابی اسلامی احکام سے متصادم نہیں، اس لیے میں بے حجاب ہونے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتی۔ اکثر نے اس کا اعتراف کیا کہ اسلام کی اقدار، حجاب کا تقاضا کرتی ہیں، لیکن ان کا کہنا تھا کہ ہمارا گھریلو اور سماجی ماحول، ہمارے تعلیمی اداروں کی عمومی فضا اور ہماری دنیا ایسی ہے کہ حجاب کے ساتھ ہم اس میں نکو اور پس ماندہ محسوس ہوں گی۔ ہم اپنے سماجی دباؤ کے آگے بے بس ہیں۔ اگرچہ بعض نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ حجاب اختیار کرنے کے بارے میں غور کریں گی۔

میں نے حجاب کا مسئلہ محض ایک مثال کے طور پر اٹھایا ہے۔ ثقافتی طور پر یہ اہم ترین مسئلہ نہیں، گو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کے بعد اس سلسلے میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمارا عمومی سوال یہ ہے کہ وہ معیار اقدار کیا ہے، جس پر ہم اپنی اور اپنے بچوں کے کردار کی بنیاد رکھیں۔ کیا اس یا پھر ان اقداری معیارات کا تعین ہمارے سماجی اور معاشی ڈھانچے، مثلاً دولت، معاشرتی رتبے وغیرہ کریں گے؟ یا کوئی ایسے آفاقی اصول ہیں، جن کی روشنی میں ان اقدار کا تعین کیا جائے گا، جنھیں ہم اپنے تعلیمی اداروں کے ذریعے فروغ دینا چاہیں گے، اور جن کے نتیجے میں ہم اپنے زمنی اور عصری تقاضوں کے پیش نظر ایک مخصوص ثقافت کی ترویج کی کوشش کریں گے؟

تقسیم ہند سے پہلے، بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک برعظیم میں مسلمانوں کی ثقافت کی بڑی حریف، ہندوانہ ثقافت تھی، جس کے اثرات ایک حد تک لباس، طعام، زبان اور رہایش، میلوں ٹھیلوں اور تفریحات میں بھی آ گئے تھے۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی سنجیدہ چیلنج کبھی پیش نہیں آیا۔ اس طرح انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب اور ثقافت نے بھی ایک محدود اقلیت کے علاوہ عوام کی اکثریت میں اپنا اثر و نفوذ پیدا نہ کیا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد، خاص طور پر بیسویں صدی کے چھٹے عشرے سے مغرب کی جو تہذیبی اور ثقافتی یلغار شروع ہوئی ہے، اس نے ہماری اقدار کے نظام میں بری طرح شکست و ریخت کی ہے، اور اس کا بڑا آلہ کار آفسٹ چھپائی کا پرنٹ میڈیا، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ اور اطلاعی فنیات (information technology) کے وسائل ہیں، جنھوں نے ہمارے گھروں میں نقب لگائی ہے۔ "ای میل" کے ذریعے بلاطلب نامطلوب مواد ہمارے گھروں میں پہنچ رہا ہے، اور بعض خواتین و حضرات برقیاتی وسائل کے ذریعے اپنے "نجی مشاغل" میں آپ کو شریک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی ظواہر ہی میں نہیں بلکہ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، باطن میں بھی آئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ظاہر اور باطن کا معاملہ یوں سادہ سا نہیں کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر کو متعین کرتا ہے۔ یہ تو ہے ہی۔ مگر صورت یوں بھی ہے کہ انسان کا ظاہر اور اس کے ظاہری اعمال بھی اس کے باطن کو متعین کرتے ہیں۔ یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہتا چلوں کہ حضرت عمرؓ اس نکتے سے خوب واقف تھے۔ جب انھوں نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر

قیمتی لباس اور شان دار سواری کے استعمال سے انکار کر دیا تھا کہ ان سے نفس میں رعونت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے عمال اور اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کو "نفیس اور قیمتی لباس زیب تن کرنے اور چھنے ہوئے باریک آٹے کی روٹی کھانے" شان دار عمارتوں میں رہایش اختیار کرنے اور دربانوں اور ہٹو بچو کے پروٹوکول سے حکماً منع کر دیا تھا' کیا وہ آیت شریفہ سے واقف نہ تھے' جس میں کہا گیا تھا: "کہہ دیجیے' کس نے زیب و زینت کی وہ چیزیں ممنوع قرار دے دی ہیں' جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں' اور کھانے پینے کی چیزوں میں سے "طیبات" کو کس نے حرام قرار دے دیا ہے....؟ (الاعراف ۷: ۳۲)

یہ سب ٹھیک ہے' یہاں سوال حلال و حرام کا نہیں' بلکہ مطلوب و غیر مطلوب کا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا' جو شکم سیر ہو کر کھانا کھائے' اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے' تو یہاں بھی سوال حلال و حرام کا نہیں ہے۔ ساتر لباس' حرام اور ممنوع نہیں' اور نہ دنیا کی کوئی زبان ناجائز ہے۔ لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اپنے تعلیمی اداروں میں (اور اپنے گھروں میں) ہم اپنے بچوں کو جو یونی فارم اور کپڑے پہناتے ہیں' جس نشست و برخواست کا عادی بناتے ہیں' جس زبان اور لہجے میں گفتگو کرنا سکھاتے ہیں' جن حرکات' سکنات اور اشارات کو ان کے لیے نمونہ بناتے ہیں' وہ سب ان کی سائیکی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغرب کے علمی' سائنسی' صنعتی' تجارتی اور مالیاتی نظام نے جس کلچر کو فروغ دیا ہے' وہ انسان کی مطلقاً آزادی کا کلچر ہے۔ اور یہی ثقافتی فضا ایک زہریلے دھوئیں کی طرح اب ساری دنیا پر مسلط ہو گئی ہے۔ اس کے مطابق انسان' حیوانات کی لاکھوں انواع میں سے کامیاب ترین نوع ہے۔ وہ فطرت کے طبعی' حیاتی قوانین کے تحت وجود میں آ گیا ہے۔ اور اپنے سوا کسی کے آگے جواب دہ نہیں کہ اس سے بڑھ کر معلوم کائنات میں کوئی ہستی نہیں ہے۔ وہ کاملاً خود مختار اور مطلقاً آزاد ہے۔ اپنا برا بھلا خود سمجھتا ہے' اور اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ خارج سے اس پر کوئی قدغن اور روک ٹوک نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ اپنا ضابطہ کردار اور منہاج حیات خود ہی متعین کرے گا' کیوں کہ اس سے ماورا کوئی ایسا وجود ہے ہی نہیں' جو اس کی ہدایت و رہنمائی کر سکے۔

انسان اور کائنات کے بارے میں اس مابعد الطبیعی نقطہ نظر نے جس تہذیب و ثقافت کی صورت گری کی ہے' اس کا مرکزی حوالہ "استحصال" ہے۔ سائنس و فنیات کے ذریعے طبعی حالات میں تبدیلیاں لانے کی قدرت' مواصلاتی نظاموں میں انقلابی تبدیلیاں' جن کے ذریعے فاصلے سمٹ گئے' اور اطلاعاتی فنیات' جس کے ذریعے علم کی لامحدود مقدار تک رسائی ممکن ہو گئی ہے' ان سب نے مل کر مقتدر انسان کو ایک طاقت ور اور حریص عفریت کی صورت دے دی ہے' جو نہ صرف فطرت اور اس کے خزانوں کے استحصال میں

معروف ہے، بلکہ اپنے بنی نوع میں سے بھی نسبتاً کمزور اور کم طاقت ور اکثریت کو اپنی حرص و طمع اور لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بناتا ہے۔ نفع عاجل اور غلبے کی ہوس میں مسابقت، اس انجن کے بنیادی ایندھن ہیں، اور ان کی تیاری، رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعے ایک عالمی کلچر کو فروغ دے رہی ہے۔

اب تعلیم و ثقافت کے ذریعے "کامیابی" کو لیجیے۔

تعلیم اور تعلیمی اداروں میں ایک تہذیب و ثقافت کے فروغ کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بچوں کو تعلیم کیوں دیتے ہیں؟ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں، لیکن ایک عمومی جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں "کامیاب" دیکھنا چاہتے ہیں۔ کامیابی کا ایک محدود مفہوم تو وہ ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ایک مخصوص ثقافت کی پیداوار ہے، جو خود بھی ایک مخصوص ثقافت کو جنم دیتی ہے، لیکن قرآن مجید جو ہماری رہنمائی کے لیے حوالے کی بنیادی کتاب ہے، کامیابی کے اس تصور کو رد کرتا ہے اور اسے "متاع حیات دنیا" یعنی دنیا کی زندگی کا ایک عارضی فائدہ قرار دیتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (اٰل عمرٰن ۳: ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس --- عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر (مال و دولت)، چیدہ گھوڑے (شان دار سواریاں) مویشی اور زرعی زمینیں (ذرائع پیداوار) --- بہت خوش آیند بنا دی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے عارضی سامان ہیں۔

حقیقی کامیابی رضائے الٰہی کے حصول کی کامیابی ہے، جو فرد کے ذاتی ترفع کی بجائے مجموعی طور پر تمام انسانوں، بلکہ اللہ کی تمام مخلوق کی بھلائی کو اپنا محور بناتی ہے، اور افراد اور گروہوں کے درمیان چھین جھپٹ اور کشاکش سے گریز کا رویہ سکھانے والی ثقافت ہے۔ اس طرح ہر وہ ادارہ، جو ایسے کلچر کو فروغ دے، جو ان اہداف کے حصول میں ممد و معاون ہو، ہمارے لیے مطلوب ادارہ ہو گا۔

مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس ثقافت کی بنیاد، توحیدی نظام عقائد اور اس الہامی مابعد الطبیعیات پر ہو گا، جو صحیح اسلامی فکر ہی میں پایا جاتا ہے۔

سولھویں، سترھویں صدی عیسوی میں، بقول ٹائن بی، انگریزوں نے بادشاہ اور خدا، دونوں کو قتل کر دیا، اور دونوں، عملاً ان کی زندگی سے باہر ہو گئے۔ مگر ان کی جگہ دوسرے خبیث اور پلید خداؤں نے لے لی، جن میں قومیت، حصول مسرت کی غایت اور کلی غلبے اور اقتدار کی خواہش پیش پیش ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عالمی ثقافت (global culture)، جس کا ہم بھی شکار ہیں، انھی دیوی، دیوتاؤں کی پیداوار ہے۔ ہمیں ان کا منحوس غلبہ ختم کر کے نظام فکر میں توحید کو اس کے حقیقی معنوں میں رائج کرنا ہو گا، کہ اسی طرح

دنیا (اور اپنے معاشرے کو) افتراق و انتشار، چھین جھپٹ، ظلم و استحصال اور زبردستوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ توحید کے حقیقی معنی کیا ہیں!

۱- یہ کہ کائنات کا خالق اور حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔

۲- کائنات کی تمام اشیا اور موجودات، بشمول انسان، اسی کے تکوینی حکم کے تابع ہیں۔

۳- انسان، چوں کہ ایک باشعور ہستی ہے، اس لیے اس کے لیے لازم ہے کہ تکوینی اطاعت (جس میں جمادات و نباتات بھی اس کے شریک ہیں) کے علاوہ شعور و اختیار کے میدان میں اس کی شعوری اور ارادی اطاعت بھی قبول کرے۔

۴- ارادی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تمام موجودات کے ساتھ انسان کا تعلق ان حدود کا پابند ہو، جو اللہ نے متعین کی ہیں۔

۵- ارادی اطاعت کا یہ بھی مطلب ہے کہ افراد انسانی، انسانی گروہوں اور فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات اس نہج پر استوار ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اجمال یا صراحت کے ساتھ متعین کر دیا ہے۔

۶- فرد کے لیے اقدار میں مطلوب و نامطلوب اور قبول و رد کا معیار بھی الہامی ہدایت کی روشنی میں ترتیب دیا جائے۔

۷- فرد کی حتمی اور آخری غایت، کائنات کی واحد مقتدر ہستی، ذات الٰہی کی رضا کا حصول ہو۔ وہ اس شعور و عقل کی روشنی میں، جو خود اللہ نے اسے عطا کی ہے، اللہ کا محب اور اس کا محبوب بننے کی کوشش کرے۔

ایک مسلم کی حیثیت سے اس نظام فکر کی مادی ہیئت اور جسمانی ظہور، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے۔ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ اللہ کی بہترین مخلوق ہیں۔ آپؐ کی ذات کامل ایک انسان کے لیے نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱)، یعنی رسولؐ کی ذات میں تمھارے لیے بہترین مثال اور نمونہ موجود ہے، کا یہی مفہوم ہے۔ افلاطون نے عالم تصورات کا ایک الگ عالم بتایا ہے، جس میں ہر تصور، اپنی نوع کے کامل نمونے کی نمایندگی کرتا ہے۔ مسلم مفکرین اور فلاسفہ نے "انسان کامل" کا تصور پیش کیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا رہبر، ماقبل تاریخ نہیں، بلکہ تاریخی عہد کی روشنی میں، اور ایسے انسانوں کے درمیان رہا، جو اپنی یادداشت کے لیے شہرت رکھتے تھے، اور دور جاہلیت میں اصنام پرستی کے باوجود ان کے سادہ ذہن، اساطیر اور دیومالائی تخلیقات وضع کرنے سے پاک تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" (اللہ کی بہترین مخلوق) کی بود و باش، رفتار و گفتار اور فکر و خیال کا ایک اہم اور قابل ذکر حصہ محفوظ رہ گیا ہے، جس کی اپنے سیاق و سباق سے ہٹ کر کورانہ تقلید اور نقل کرنے کے بجائے اس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کو استوار کر سکتے ہیں، اور اپنے حالات کے مطابق ایسی

تہذیب و ثقافت کو جنم دے سکتے ہیں، جو "مزاج رسولؐ" سے ہم آہنگ اور اس سے قریب تر ہو۔

مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھ کر نہ صرف مدارس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصاب میں، بلکہ ان کے ماحول میں بھی ایسی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں، جو مجموعی طور پر ہمارے طلبہ کی زندگی کو زیادہ بامعنیٰ، صاف ستھری اور اعلیٰ مقاصد سے ہم آہنگ بنا سکے۔

طلبہ میں ساری کائنات اور موجودات کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھنے کا شعور اس طرح پیدا کیا جائے کہ وہ عالم فطری کو اپنا حریف اور دشمن یا لاوارث کا مال سمجھ کر اسے لوٹنے کھسوٹنے اور اس کا استحصال کرنے کی بجائے اپنا دوست اور ساتھی سمجھیں۔ اپنی ملکیت اور دوسری چیزوں کو اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال کریں۔ کفایت اور قناعت کی عادت ڈالیں۔ مگر اس کے لیے مدارس کا ماحول سازگار یا ناسازگار ہو سکتا ہے۔ عالی شان مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے "شان دار" ادارے، جو قیمتی فرنیچر اور سازوسامان سے آراستہ ہوں، جن میں کمروں کو ٹھنڈا اور گرم کرنے کے لیے برقی توانائی کا بے تحاشا استعمال ہو رہا ہو، دن کے وقت کمروں میں پردے ڈال کر ہر کمرۂ جماعت میں درجن بھر ٹیوب لائٹس روشن کر دی جائیں، سادہ چاک اور تختہ سیاہ کی بجائے درآمد شدہ قیمتی قلم اور تختہ سفید استعمال ہوں، ابتدائی جماعتوں میں سلیٹ اور تختی کی جگہ، جس پر بار بار لکھ کر مٹایا اور دوبارہ لکھا جا سکتا ہے، کاپی، پنسل، بال پن استعمال کرائے جاتے ہوں، جنھیں استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے (اب مدارس میں ڈیسک پر روشنائی کی دواتوں کا رواج متروک ہو چکا ہے)۔ استعمال کرو اور پھینک دو کی ثقافت (culture of the disposable) جہاں ایک ایک مضمون کے لیے کئی کئی قیمتی کاپیوں اور رجسٹروں کا خریدنا لازم قرار دیا گیا ہو، بچوں کے بستے سادہ موٹے کپڑے کی تھیلیوں کے بجائے ہم جو کوہ پیماؤں کی زنبیلیں معلوم ہوں، جو بیرونی ملکوں سے درآمد کی گئی ہیں، یا انھی کے نقشوں پر تیار کی گئی ہیں، جب بچوں کی وردیوں سے سادگی اور کفایت شعاری کی بجائے ٹھاٹھ باٹھ کی امیرانہ زندگی آشکارا ہو، اور سب سے بڑھ کر، ان کے استاد اور استانیاں جن میں سے اکثریت، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی حسن خانے سے نکل کر آ رہی ہیں) قیمتی لباس، تصنع اور مسرفانہ طرز حیات کے نمونے نظر آئیں، ایسے ماحول میں سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کس طرح سودمند ثابت ہو سکتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے پیوند لگے کپڑوں، چھوٹے سادہ مکانوں اور تکلف اور آرایش سے عاری رہایش اور سادگی و فقر کے قصے کیوں کر قابل اعتماد اور موثر ہو سکتے ہیں؟ آج کوئی بچہ یا نوجوان، سینگ والے لال، کالے دیوؤں اور پر دار اڑتی پھرتی پریوں پر یقین نہیں کرتا، نہ ہی اصنام پرست پڑوسی، دیوی دیوتاؤں کو حقیقی کردار جانتے ہیں۔ یہ سب دلچسپ قصے اور صنمیات ہیں۔ ہمارے بچوں کے لیے بھی دور اول کے قصے، صنمیات ہی ہیں، اگرچہ مقدس، جن کے خلاف زبان کھولنا ممنوع ہے۔ اگلے لوگوں کی کہانیاں، تلقین کے لیے ہیں، تقلید کے

لیے نہیں۔ سنجیدہ اور دین دار لوگوں کی مجالس میں بھی اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرون اولیٰ کے بزرگوں کی تقلید آج کون کر سکتا ہے!

ٹائم میگزین کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر روز ۳۵ ہزار انسان (بوڑھے' بچے اور جوان) بھوک سے مرجاتے ہیں (اور اس سے کئی گنا زیادہ علاج معالجے کی نارسائی سے)۔ جہاں یہ صورت حال ہو' وہاں اگر آپ کا بچہ ۲۰ تا ۱۰۰ روپے یا اس سے بھی زیادہ کوڑا خوری (junk food) اور مشروبات کی بوتلوں اور ڈبوں پر صرف کر دے' آدھے آدھے برگر اور کباب کھا کر پھینک دے اور بوتلوں سے چند گھونٹ لے کر انھیں کنارے ڈال دے' تو کس منہ سے ہم اسے ضیاع اور مسرفانہ طرز حیات کے کلچر سے بچا لے جائیں گے؟ تصنع' تکلف' آرایش' نمایش اور مسرفانہ طرز حیات سے تنفر پیدا کرنے اور خاکساری' سادگی' سخت کوشی' محنت اور مجاہدانہ زندگی کی عظمت پیدا کرنے کے لیے نہ صرف اساتذہ کو ایک بہتر نمونہ پیش کرنا ہو گا' بلکہ بحیثیت مجموعی تعلیمی ادارے کی فضا بھی ایسی بنانی ہو گی' جہاں یہ صفات و اقدار بالکل فطری اور ادارے کی آب و ہوا سے ہم آہنگ محسوس ہوں۔ یوں نہ ہو کہ کوئی بچہ ان موخر الذکر اوصاف و عادات کو لے کر مدرسے میں آئے تو خود کو اجنبی اور کمتر محسوس کرے۔

مگر اس کام کے کرنے کے لیے وہ قوت متخیلہ درکار ہے' جو مدرسے کی عمارات' فرنیچر اور سازوسامان سے لے کر اس کے یونی فارم اور نظم و انصرام' سب کو ایک خاص انداز پر استوار کر سکے' تاکہ بچوں میں' دوسرے مدرسوں کے بچوں کے مقابلے میں احساس کمتری بھی پیدا نہ ہو' اور وہ اپنی روایات اور ثقافت کو بہتر' برتر اور زیادہ سہولت بخش محسوس کر سکیں' ان پر فخر کر سکیں' اور ان کی حمایت و مدافعت کے لیے آمادہ ہوں۔

مسابقت کا رجحان ان داعیوں میں سے ایک ہے' جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی ترقی کی راہیں کھول دی ہیں لیکن دوسروں سے کن باتوں میں برتر بننے کی کوشش کریں' اس فیصلے کے لیے کوشش خود انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ سارے کھیل اور امتحانات ایسی مسابقت کے اظہار ہیں۔ بدقسمتی سے مغرب سے درآمدہ "یونانی رومی کلچر" کے زیر اثر ہمارے مدارس میں (خصوصاً مہنگے اسکولوں / کالجوں اور جامعات تک میں) کھیلوں اور جسمانی صلاحیتوں کے فروغ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے' جس کے نتیجے میں طلبہ و طالبات' جسمانی برتری ہی کو معیار فضیلت بنا لیتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں عموماً علمی فضا سرے سے مفقود ہے۔ کتب خانے یا تو محض تبرک کی خاطر ہوتے ہیں' یا نمایش کے لیے۔ ان میں اکثر طلبہ کا داخلہ ہی ممنوع ہوتا ہے۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں کتب اور جرائد کی خریداری کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح اسکول اور کالج صرف نصابی کتب کی حد تک علم کے معطی بن گئے ہیں۔ وسیع معنوں میں علم کی جستجو اور تحقیق' طلبہ تو درکنار' الا ماشاء اللہ اساتذہ میں بھی مفقود ہے کہ وہ "بے مصرف علمی ذخیرے" میں اضافے کے بجائے وقت کو ایسے مشاغل میں صرف کرنا پسند کرتے ہیں' جن کی نقد قدر ہو۔ اس طرح تعلیمی

اداروں میں سے بیشتر میں "علمی ثقافت" مفقود ہوتی جا رہی ہے، جب کہ مغرب کے کئی ملکوں میں یہ بڑی حد تک زندہ ہے۔ اس علمی ثقافت کو زندہ کرنے اور اسے توانا بنانے کے لیے کتب خانوں اور کمرۂ ہائے مطالعہ پر توجہ دینی ہو گی۔ کتب خانوں میں نئی نئی کتابوں کے اضافے طلبہ کو ان کے مطالعے کے لیے راغب کرنے کے لیے ان کے خلاصے تیار کرانے اور ان پر بحث و مباحثے کے ذریعے یہ کام سہولت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ایک مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب سے ہمارے طلبہ بڑی تیزی سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک اچھے تعلیمی ادارے میں، میں نے کلاس میں طلبہ سے پوچھا کہ کس نے "توبتہ النصوح" یا "باغ و بہار" پڑھی ہے؟ چالیس کی جماعت میں ایک بھی نہ نکلا جس نے ان کا مطالعہ کیا ہو، سوائے ان اقتباسات کے جو درسی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک آدھ نے بتایا کہ اس نے "مسدس مدوجزر اسلام" پڑھی ہے۔ دیوان غالب، ضرب کلیم اور بال جبریل بھی کسی نے پوری نہیں پڑھی تھی۔ ایک ذہین طالب علم، جنھیں شعر سے شغف بھی تھا، اس بات پر حیران تھے کہ حضرت جبریلؑ کے بال (hair) میں ایسی کیا بات ہے کہ کتاب کا عنوان یوں رکھا جائے۔ یہ سب خیر سے گریجویشن کی سطح کے طلبہ تھے۔ یہی حال شبلی کی سیرت النبیؐ جلد اول و دوم اور مولانا مودودی کی دینیات جیسی بنیادی کتابوں کا ہے۔ ہمارے مدارس اور کالجوں کے کم ہی طلبہ ان کے قاری ہیں۔

اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور گریجویشن کی سطح تک کے تعلیمی نصاب میں تدریج کے ساتھ، غیر امتحانی نصاب کا اضافہ کیا جائے، جس میں اردو کے کلاسیکی ادب، نثر و نظم، کچھ علمی اور تاریخی کتابوں اور کچھ تراجم کو شامل کیا جائے۔ اس ضمن میں شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان (منتخب اجزا)، اقبال کی ضرب کلیم اور اسرار و رموز، ٹامس کارلائل کی "Our Heroes" اور "Hero-Worship"، افلاطون کی "Apology" اور "Crito"، سری کرشن جی کی بھگوت گیتا کے منتخب حصے، حالی کی مسدس، مولوی نذیر احمد کی توبة النصوح، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر (ترجمہ محمد سلیم عبداللہ)، ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی کے خطبات بہاولپور، سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس، شبلی کی الفاروق، سرسید اور غالب کے خطوط اور اس طرح کی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جنھیں مختلف درجات کے طلبہ ضرور پڑھیں۔ مندرجہ بالا کتابوں کے نام ارتجالاً ذہن میں آ گئے، ان میں بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مختلف علوم کے جرائد سے اعلیٰ ثانوی اور کالجوں کے طلبہ کو متعارف کرایا جانا ضروری ہے تاکہ وہ قدیم ورثے کے ساتھ نئی تحقیق اور علوم میں پیش رفت سے بھی آگاہ رہیں۔ اس طرح ان کا علمی افق بھی وسیع ہو گا، ان میں مطالعے کی عادات راسخ ہوں گی، اور ان کا ذہن بھی کھلے گا۔

اخبار امت

انڈونیشیا: بحرانوں کے درمیان راستے کی تلاش

مسلم سجاد

دنیا کا چوتھا سب سے بڑا، اسلامی دنیا کا سب سے بڑا، ۲۰ کروڑ آبادی کا ۱۳ ہزار سے زائد کا مجمع الجزائر، انڈونیشیا ان دنوں ۳۲ سالہ آمریت کے مابعد اثرات کے تحت بحران کا شکار ہے۔ مسلم معاشروں کا یہ انداز (pattern) کہ عوام کو جمہوری حقوق سے محروم رکھنے والے فوجی حکمراں طویل مدت تک ترقی کے راگ الاپ کر جب عوامی تحریک کے تحت رخصت کیے جاتے ہیں تو پھر بھی عوام کو ان کی قربانیوں کے ثمرات نہیں پہنچتے، ماہرین عمرانیات کی تحقیق کا موضوع بننا چاہیے۔

اقتدار کے مراکز پر قابو رکھنے والے آسانی سے دست بردار نہیں ہوتے اور کسی نئے جمہوری لبادے میں پھر سے براجمان ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر تحریک کی قیادت کرنے والے باشعور اور متحد نہ ہوں، تو یہ عناصر اپنے ایک نئے دور کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ہم خود ان مراحل سے گزرے ہیں، اب انڈونیشیا کو گزرتے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہماری صحافت کا المیہ اور ملت کی بدقسمتی ہے کہ پاکستان کے کسی اخبار یا ایجنسی کا نمایندہ برادر مسلم ملک کے حالات کا مطالعہ کرنے کا اور اہل وطن کو ان سے آگاہ کرنے کے لیے جکارتا میں موجود نہیں ہے۔ ہمیں دوسروں بلکہ غیروں کی نظر سے ہی سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔

مئی میں سہارتو کی علیحدگی اور بی جے حبیبی کے صدر بننے کے بعد، حکومت کو معیشت سنبھالنے کے ساتھ ساتھ، ملکی نظام میں ایسی اصلاحات بھی کرنا تھیں، جن سے ملک میں جمہوری اقدار رائج ہو جائیں۔ قومی اسمبلی میں ۷۵ ممبر فوج کے نامزد کردہ ہوتے ہیں۔ سول انتظامیہ میں بھی ہر سطح پر فوج کی باقاعدہ شرکت ہوتی ہے۔ سرکاری گولکار پارٹی کے علاوہ، تمام سیاسی پارٹیاں ایسی تبدیلیاں چاہتی ہیں کہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہونے والے ہی حقیقی حکمراں ہوں اور فوج بیرکوں میں رہے۔ بہت وقت ہو گیا کہ حکومت طے کرتی رہی کہ عوام کے لیے کیا اچھا ہے، اب عوام یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ کون سی حکومت ان کے لیے اچھی ہے۔ موجودہ حکومت سے عوام کا پرزور مطالبہ ہے کہ سہارتو اور اس کے ساتھیوں پر مقدمات چلائے جائیں اور ناجائز دولت ان سے وصول کی جائے۔ بیٹوں، بیٹیوں اور دامادوں کے علاوہ صرف سہارتو کے اپنے ۴۰

ارب ڈالر جمع ہیں۔

۱۳ نومبر کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر مظاہروں کے لیے پہلے سے تیاری جاری تھی۔ اسمبلی کے انتخابات کے لیے مئی ۱۹۹۹ اور صدر کے انتخاب کے لیے ۲۹ اگست ۱۹۹۹ کی تاریخ کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ مظاہرین کو روکنے کے لیے گولی چلائی گئی جس سے' ۱۴ افراد جس میں ۶ طلبہ تھے' ہلاک ہوئے۔ فوج کے بیان کے مطابق جو گولیاں جسم سے نکلی ہیں وہ فوج نے نہیں چلائیں' اس لیے سازشی عناصر کی کارفرمائی سب ہی کو نظر آ رہی ہے۔ اگلے دن ملک کے ۱۶ شہروں میں مظاہرے ہوئے اور اسمبلی کی عمارت پر ۸۰ ہزار افراد نے مظاہرہ کیا۔ پہلی دفعہ انسانی ڈھانچے ہاتھ میں لے کر مظاہرے کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ یوں' از سرنو تحریک شروع ہو گئی۔

سہارتو کو علیحدہ کرنے میں فوج کے کردار کی وجہ سے کمانڈر ان چیف جنرل ورانتو عوام کی پسندیدہ شخصیت بن گئے تھے۔ لیکن حالیہ مظاہروں میں گولیاں چلانے کی وجہ سے اب ان کے استعفے کا مطالبہ بھی ہو رہا ہے۔ طلبہ مظاہرین حبیبی کے استعفے کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں جو مطلوبہ اصلاحات نہیں کر رہے ہیں۔ دونوں افراد بہرحال پرانے نظام کی علامت ہیں۔

انڈونیشیا دینی رجحانات رکھنے والا ملک ہے۔ احیائے اسلام کی لہر بھی وہاں پہنچی ہے۔ ۹۰ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ مئی کی تحریک میں محمدیہ جماعت کے سربراہ امین رئیس' قائد کی حیثیت سے ابھرے۔ اب وہ زیادہ وسیع ابنیاو نیشنل فاؤنڈیشن کے سربراہ ہیں اور صدارتی منصب کے متوقع امیدوار ہیں۔ دوسری بڑی جماعت نہضۃ العلما ہے جس کے ۴ کروڑ ممبر بتائے جاتے ہیں اور جن کے قائد عبدالرحمٰن واحد ہیں۔ سابق صدر سوئیکارنو کی بیٹی میگاوتی کی جمہوری پارٹی سیکولر عناصر کی نمایندہ کہی جا سکتی ہے۔ ایک تجزیے کے مطابق حالیہ مظاہرے اسی پارٹی کے ایما پر ہوئے ہیں جسے انتخابات میں کسی بڑی کامیابی کی توقع نہیں ہے۔ اسے فوج کے ان سازشی عناصر کی حمایت بھی حاصل ہے جو ایک صحیح جمہوری نظام میں اپنے لیے گنجایش نہیں پاتے اور اسلامی احیا کو روکنا چاہتے ہیں۔ امین رئیس اور عبدالرحمٰن واحد' خواہی نخواہی حبیبی کے حامی سمجھے جانے لگے ہیں۔ حبیبی' بہرحال پرانے نظام کا کل پرزہ ہے اور فوج اور گولکار اسی کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک نیا نام آدم سوسانو کا ہے جو اس وقت وزیر ہے۔ اسے اسلامک ایکٹی وسٹ (activist) کہا جا رہا ہے۔ ۵۲ ہزار امداد باہمی کے اداروں کو وسائل فراہم کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ پورے ملک کے دورے کر رہا ہے۔ صرف ۵۰ سال عمر ہے۔ ایک رسالے کے مطابق: حبیبی رہے یا نہ رہے' سوسانو رہے گا۔

اس وقت انڈونیشیا کی معاشی صورت حال بالکل ابتر ہے۔ ۱۵ ہزار روپے ایک ڈالر کے برابر ہو گئے ہیں۔ دو سال پہلے صرف ۲ کروڑ افراد غربت کی سطح کے نیچے تھے۔ اب یہ تعداد ۸ کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔ اچھے

خاصے خوش حال غریب ہو گئے ہیں۔ تقریباً ۵ کروڑ افراد غذائی قلت کا شکار اور صومالیہ سے بد تر حالات سے دوچار ہیں۔

امن و امان کی صورت حال بھی سخت غیر تسلی بخش ہے۔ اوائل اکتوبر میں یہ اطلاعات آنا شروع ہوئیں کہ دوسرے بڑے صوبے جاوا کے مشرق میں' ۱۵ لاکھ آبادی کے شہر بین یووانگی میں علما' موذنوں اور معروف مسلمانوں کو نقاب پوش افراد (ننجا) کالا جادو کرنے والے قرار دے کر قتل کر رہے ہیں۔ وسطی اور مغربی جاوا کے قصبات میں بھی ایسے ہی واقعات ہوئے۔ اب تک کل ۸۰ افراد ہلاک کیے جا چکے ہیں۔ یہاں نہضۃ العلما کا رسوخ ہے۔ عبدالرحمٰن واحد کا کہنا ہے کہ انھیں امین رئیس کی پارٹی سے لڑوانے کے لیے یہ کارروائی کی جا رہی ہے۔

ملک میں عیسائی ۹ فی صد ہیں۔ سابق پرتگیزی نو آبادی مشرقی تیمر (Timor) کو مغربی میڈیا نے بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے اور موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر خود مختاری' علیحدگی اور آزادی کے منصوبے مکمل کیے جا رہے ہیں۔ بعض علاقوں میں عیسائیوں کو قتل کرنے اور چرچ جلانے کے واقعات ہوئے ہیں اور اسی طرح عیسائی اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں پر حملے ہوئے ہیں اور مسجدیں جلائی گئی ہیں۔ حکومت امن و امان قائم کرنے میں ناکام ہے اور ایک رائے کے مطابق اس کے بعض عناصر' ہمارے عرف کے مطابق 'ایجنسیز' خود اس کی ذمہ دار ہیں۔ سیکولر اور دینی عناصر کی کش مکش کو پر تشدد بنانا بھی پیش نظر ہو سکتا ہے۔

انڈونیشیا کا ایک مسئلہ چینی نژاد آبادی کا ہے جو ۴ فی صد ہیں۔ یہ صنعت و تجارت میں آگے ہیں اور بہتر مالی حیثیت کی وجہ سے اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ سہارتو نے مشترک مفادات کے تحت ان کی بہت سرپرستی کی۔ اسی لیے یہ مئی کی تحریک میں عوام کی نفرت کا نشانہ بنے۔ چینیوں پر مظالم کی بڑی خبریں بنیں۔ اب امین رئیس اور عبدالرحمٰن واحد کے بیانات نسلی گروہوں کے اطمینان کا باعث ہوئے ہیں۔

انڈونیشیا کا مسلمان ایک امن پسند فرد ہے۔ کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا کہ خوں ریزی کی کارروائیاں ایک مسلمان کر سکتا ہے۔ یہی سمجھا جا رہا ہے کہ جن عناصر کو اقتدار جاتا نظر آ رہا ہے' وہ اسے بچانے کے لیے ملک کے استحکام کو داؤ پر لگانے کو بھی تیار ہیں۔ ملک ٹوٹنے کی بات بھی کہی جا رہی ہے۔

حبیبی کی موجودہ حکومت کو' ملک کے مفاد میں' یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا اصل فریضہ جلد از جلد پرامن انتخابات کا انعقاد اور حقیقی نمایندوں کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرنا ہے۔ موجودہ صدر کسی کے بھی پسندیدہ نہیں ہیں اور وہ اقتدار چھوڑنے کا اعلان بھی کر چکے ہیں لیکن خیال کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی حالات میں اپنے لیے جگہ بنانے کے خواہاں ہیں اور سابقہ عناصر' ان کے ذریعے اور کچھ نئے چہروں کے ساتھ' شرکت اقتدار کے ذریعے اپنے برقرار رہنے کی حکمت عملی اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک معقول مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ موجودہ حکومت مستعفی ہو' اور چار بڑی پارٹیوں کی عبوری حکومت قائم ہو جو جلد از جلد انتخابات کروائے۔ لیکن یہ

راہ عمل موجودہ حکمراں بھلا کیوں اختیار کریں؟

انڈونیشیا کے ہمارے مسلمان بھائی آج جن حالات سے گزر رہے ہیں' انھیں سمجھنا ہم اہل پاکستان کے لیے مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ شاید یہ مسئلہ ہر مسلمان ملک کا ہے کہ عوام کو ان کی مرضی کی حکومت کس طرح ملے؟ فوج قبضہ کر کے' پورے معاشرے کو تلپٹ کر دیتی ہے۔ اصلاح پسند عناصر' تحریکیں منظم کرتے ہیں' عوام نکلتے ہیں' قربانیاں دیتے ہیں' بہت سے بہت' چہروں کی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ انڈونیشیا میں عوامی احتجاج کی نمایندہ اسلامی قوتوں کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی کا یہ امتحان ہے کہ وہ اپنی عوامی حمایت کو کس طرح متشکل کر کے حکومت کے ایوان میں نظر آئیں۔ معمول کا جمہوری نظام قائم ہو تو مسئلہ صرف عوامی حمایت حاصل کرنے کا رہ جاتا ہے لیکن آمرانہ نظام میں کارندے اس طرح چمٹ جاتے ہیں کہ علیحدہ ہوتے ہوتے ملک کو تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور ملک کے مخلص اور بہی خواہ' ملک کی خاطر سابقہ عناصر کو برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ مخمصہ آج کے مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس پر غور و فکر اور تحقیق ہونا چاہیے۔ کتابوں میں تبدیلی کی راہ بتانا ایک بات ہے' اور دیے ہوئے معروضی حالات اور زمینی حقائق میں اسے برپا کرنا شے دگر است۔ ایک دوسرے سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے سب تجربات کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

اسلام کا قانون بین الممالک

ایک مطالعہ

رفیع الدین ہاشمی

مختلف علوم کے ماہرین اور اصحاب فکر و دانش کے توسیعی خطبات' دور جدید میں علمی دنیا کی ایک قابل قدر اور مستحسن روایت ہے۔ اس سلسلے میں سیرت النبیؐ پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کے "خطبات مدراس" (۱۹۲۵) اور اسلام میں فکر دینی کی تشکیل نو پر علامہ اقبالؒ کے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam (۱۹۲۹-۳۰) کو برعظیم پاکستان و ہند کے دینی اور فکری لٹریچر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی تاریخ قرآن حکیم' حدیث نبوی' تاریخ فقہ' اسلام کا نظم مملکت' نظم وفاع اور نظم تعلیم و تربیت وغیرہ پر عالم اسلام کے مایہ ناز اسکالر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بارہ خطبات ہیں' جو انھوں نے ۱۹۸۰ میں بہاول پور کی اسلامیہ یونی ورسٹی کی دعوت پر دیے تھے۔ اور "خطبات بہاول پور" کے عنوان سے متعدد بار چھپ چکے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

مذکورہ یونی ورسٹی نے اسی تسلسل میں "خطبات بہاول پور-۲" کا اہتمام کیا۔ ۱۹۹۵ میں معروف اسکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے "اسلام کا قانون بین الممالک اور جدید دور میں ریاستوں کے باہمی تعلقات" پر بارہ لیکچر دیے' جنھیں یونی ورسٹی نے حال ہی میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ جناب محمود احمد غازی انگریزی' عربی اور اردو میں متعدد بلند پایہ علمی کتابوں کے مصنف ہیں اور اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی میں پروفیسر شریعہ اور یونی ورسٹی کے نائب صدر برائے علمی امور کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اسلامی قانون بین الممالک کے مختلف پہلوؤں پر اگرچہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' ڈاکٹر ہانس کروزے (جرمنی) اور عرب قانون دان فقہا استاد علی علی منصور' ڈاکٹر عبدالکریم زیدان' ڈاکٹر وہبہ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' پنجاب یونی ورسٹی' اورینٹل کالج' لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں

زحیلی اور عراقی مسیحی اسکالر ڈاکٹر مجید خدوری نے خاصا وقیع اور تاریخ ساز کام کیا ہے۔ اور اب اس موضوع پر ایک قابل قدر ذخیرۂ علم و تحقیق موجود ہے، اس کے باوجود اسلام کے قانون بین الاقوام کی مزید توضیح و تعبیر اور تفسیر و صراحت کی جیسی اور جتنی ضرورت آج ہے، خصوصاً دور جدید کے تناظر میں، شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ جناب محمود غازی کا یہ احساس بجا ہے کہ جب تک ہم جدید دور کے مغرب زدہ اور لادینیت گزیدہ دانش وروں کو عقلی دلائل سے مطمئن نہیں کریں گے کہ اسلام کا قانون، سچ مچ انسانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کر دیتا ہے، اس وقت تک ہم خود اسلامی ممالک میں بھی اسلامی قوانین کی نفاذ کی راہ میں پیش رفت نہ کر سکیں گے (ص ۷)۔

اصول شریعت اور اسلامی قانون کے بارے میں ہماری ناواقفیت اور اس بارے میں، خصوصاً مغرب زدہ طبقے کی، کم علمی اور ذہنی الجھن بار بار سامنے آتی ہے۔ اس کا اندازہ بعض مواقع (جیسے ۱۹۷۹ء کے حدود قوانین، ۱۹۸۴ کا قانون شہادت، ۱۹۹۰ کا قانون قصاص و دیت آرڈی ننس، توہین رسالت کا قانون، اس طرح امتناع قادیانیت آرڈی ننس کے نفاذ) پر اٹھائے جانے والے اعتراضات سے ہوتا آیا ہے۔ دین و شریعت کے بارے میں شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں میں مغربی ذرائع ابلاغ اور بعض اقلیتی مذہبی لیڈروں کی کوشش تو قابل فہم ہیں مگر بعض مسلمانوں کی طرف سے ان کی ہم نوائی بہت افسوس ناک ہے اور عبرت ناک بھی ـــــ (اس کا سبب خواہ کچھ ہو ـــــ کم علمی، بدنیتی یا لادینی تعلیم کے سبب ان کی مغرب زدگی) ـــــ اس صورت حال میں تبدیلی وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس کے لیے "ایک بھرپور فکری تحریک" ناگزیر ہے۔

غازی صاحب نے بارہ خطبات میں موضوع اور اس کے متعلقات کی مختلف جہتوں پر جس تفصیل اور جامعیت سے گفتگو کی ہے اس سے نظام زندگی میں دین، شریعت اور فقہ کا مقام، ان کی انفرادیت اور معنویت روشن ہو جاتی ہے۔ ان فاضلانہ خطبوں میں اسلام کے قانون بین الممالک کا تاریخی اور تقابلی جائزہ، اسلام کا تصور ریاست اور فلسفہ ہجرت: بین الاقوامی تناظر میں، اسلام میں غیر جانب داری، اسلام کا تصور جنگ اور قانون جنگ، اسلامی ریاست اور غیر مسلموں سے اس کے تعلقات، اسلام میں پرائیویٹ انٹرنیشنل لا اور جدید لادینی ریاستوں میں مسلم اقلیتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ عالمانہ خطبات بہ ظاہر تو مندرجہ بالا عنوانات ہی سے بحث کرتے ہیں، مگر ان میں اسلامی نظام حیات کے بعض دیگر پہلوؤں پر بھی بہت سی مفید باتیں، معلومات اور واقعات و تجربات آگئے ہیں۔ یہاں ان خطبات کے جملہ مطالب و مباحث کا تعارف تو بہت مشکل ہے، البتہ چند قابل ذکر نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ قانون بین الاقوام کی تحریر و تدوین میں مسلمانوں کو مسلمہ طور پر اولیت حاصل ہے۔ امام محمد بن

الحسن الشیبانی (وفات ۸۰۵ھ) کی کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر، اس موضوع پر قدیم ترین تصانیف ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے مغربی باوا آدم اور ڈچ قانون دان ہیوگو گروشیئن کی کتاب، قانون جنگ و صلح ۱۶۲۵ میں منظر عام پر آئی۔ اس باب میں الشیبانی کی اولیت مسلمہ ہے (ص ۲۹)۔ اہل فرنگ بھی انھیں بین الاقوامی قانون کا بانی کہتے ہیں (ص ۱۳۱)۔

۲- یہ سمجھنا کہ اسلامی قانون عرب ملوکیت سے متاثر ہے، سراسر لاعلمی ہے [اور بعض مصنفین کی بدنیتی بھی]۔ ممکن ہے کسی ایک آدھ جزوی معاملے میں کسی فقیہ نے کسی حکمران کی رعایت سے اپنے فتووں میں نرمی کر دی ہو، لیکن ایسے فتاویٰ کو کبھی بھی رواج اور قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ سرکاری اثرات سے آزادی، اقتدار و حکومت کے مقابلے میں مکمل خود مختاری اور ریاستی بالادستی سے انکار، فقہ اسلامی کی سب سے نمایاں امتیازی خصوصیت ہے (ص ۳۷)۔

۳- اسلام کے قانون بین الممالک کے مقاصد میں دنیا میں عدل و انصاف کا قیام، خارجہ پالیسی میں دعوت اسلامی کی تسہیل و ترجیح، اعلاے کلمۃ اللہ، دنیا میں امن و سلامتی کا قیام، اسلامی ریاست (ریاستوں) کا استحکام اور مسلم اقلیتوں کا تحفظ شامل ہے۔ ان مقاصد میں اپنے اور پرائے کی تمیز نہیں اور عدم تفریق ہی بین الاقوامی تعلقات کی اساس اور بنیاد ہے۔۔۔ اسلامی ریاست غیر مسلموں کو فراخ دلی سے مراعات دیتی ہے بلکہ حقوق اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے مسلم اکثریت کے مقابلے میں، غیر مسلم اقلیت کی پوزیشن، بسااوقات بہتر ہوتی ہے۔ اس ضمن میں جزیے کی بحث میں، جناب محمود غازی نے تاریخ اسلام سے بہت سی مثالیں دی ہیں، مثلاً یہ کہ مسلمانوں کے لیے تو زکوٰۃ کے احکام میں کوئی رعایت یا چھوٹ نہیں مگر فقہا نے غیر مسلموں کو جزیے میں بعض مراعات دی ہیں۔ اس طرح ایک مسلمان لازمی فوجی خدمت کا پابند ہے، مگر غیر مسلموں پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے (ص ۲۳۰) وغیرہ۔

بین الاقوامی تعلقات میں مسلمانوں نے معاہدوں اور قول و قرار کی ایسی پابندی کی کہ باید و شاید۔ تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ غازی صاحب نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ دور فاروقی میں دمشق اس طرح فتح ہوا کہ سپہ سالار حضرت ابوعبیدہؓ نے اہل شہر سے مصالحت کر لی اور شہر میں ایک جانب سے داخل ہو گئے جب کہ مخالف سمت سے کمانڈر حضرت خالد بن ولیدؓ کا داخلہ فاتحانہ ہوا۔

ابوعبیدہ اور خالد اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار، شہر میں ایک جگہ آکر ملے تو وہاں دونوں کو صورت حال کا علم ہوا، مگر اسلام کے انٹرنیشنل لا پر عمل درآمد پر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ فوراً ایک لکیر کھینچ کر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اتفاقی امر یہ کہ شہر کا گرجا بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا کہ لکیر اس کے درمیان سے گزرتی تھی۔ چنانچہ شہر کے اس حصے پر جسے حضرت خالدؓ نے فتح کیا تھا، فتح کے احکام کا نفاذ کیا گیا اور

حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھوں جو علاقہ فتح ہوا تھا اس پر صلح کے احکام نافذ کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں آدھا گرجا، مسجد بنا دیا گیا اور باقی آدھا، گرجا ہی رہنے دیا گیا۔ شہر کے آدھے حصے پر اسلامی قانون کے احکام لاگو کیے گئے اور آدھے حصے پر، جو حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھوں فتح ہوا تھا، بدستور عیسائی احکام باقی رکھے گئے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے جب مسلم احکام والا علاقہ زیادہ عدل و مساوات اور بھائی چارے کا مظہر بنا تو عیسائی رعایا بھی جلد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی اور اس کے پرزور مطالبے پر شہر کے باقی ماندہ حصے پر بھی مسلم احکام نافذ کر دیے گئے۔ یہ احکام اس وقت تک لاگو نہیں کیے گئے، جب تک کہ خود عیسائی آبادی نے اس کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

۴۔ مسلمانوں کے علاوہ دیگر قوموں کے قانون بین الاقوام میں بہت سی خامیاں ہیں، مثلاً ان کے ہاں بالعموم دو طرح کے قانون ہیں۔ ایک نظام قانون اپنوں کے لیے اور دوسرا، غیروں کے لیے۔ اس تفریق کے پس منظر میں اپنی نسلی یا سیاسی بالاتری کا تصور کارفرما رہا، چنانچہ دنیا کی چار بڑی طاقتوں کے درمیان ۱۸۱۵ میں ایک بین الاقوامی اتحاد قائم ہوا جسے مقدس اتحاد (Holy Alliance) کہا جاتا ہے۔ اس کے تین "اصول" تھے، اول: سلطنت عثمانیہ کی تباہی، دوم: جمہوریت کی سرکوبی، سوم: نپولین بوناپارٹ کی اولاد کو اقتدار سے باہر رکھنا (ص ۱۰۰)۔

اس تیسرے "اصول" کی وجہ کیا تھی؟ نہیں معلوم، ماسوا اس کے کہ ایک روایت کے مطابق نپولین کے اجداد عرب تھے۔

غیر مسلموں کے قانون بین الاقوام کی عملی افادیت یا ان کا انطباق مشکوک ہے۔ مہاتما بدھ کے پیروکار کہتے ہیں کہ وہ کسی قسم کی طاقت اور قوت کے استعمال کے سخت خلاف تھے۔ اسی طرح عیسائی دانش ور حضرت مسیحؑ سے فخریہ طور پر یہ بات منسوب کرتے ہیں کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دیں مگر عمل کی دنیا میں بدھ اور مسیحؑ کے پیروکاروں نے ان اصولوں کی پاسداری کبھی نہیں کی [زیادہ صحیح: وہ ان اصولوں کی پاسداری نہیں کر سکے کیوں کہ یہ غیر فطری اور ناقابل عمل ہیں]۔ اس کے برعکس اسلام، قوت و طاقت کے استعمال کو مطلق حرام قرار نہیں دیتا، بلکہ وہ جنگ اور جہاد کا ایک ایسا منفرد تصور دیتا ہے جو شریعت اور قانون کے اصولوں اور اخلاقیات کے ضابطوں کا پابند ہے (ص ۲۵۴، ۲۵۵)۔ اور دنیا سے فتنہ و فساد کے خاتمے کا ضامن ہے۔

جدید مغربی قانون بین الاقوام، ایک مکمل اور جامع انسانی قانون دینے میں بڑی حد تک ناکام رہا ہے۔ نورم برگ کے مقدمے سے لے کر خلیج کی جنگ کے دوران میں ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلوں تک، بے شمار ایسے مواقع آئے جہاں دنیا نے صاف دیکھا کہ یہ قانون، عدل و انصاف اور اخلاق سے اتنا ہی تعلق رکھتا ہے

جتنا جنگلی جانور۔ یہاں طاقت ہی کا اصول، فیصلہ کن تسلیم کیا جاتا ہے اور زور آور ہی کو تمام حقوق اور مراعات حاصل ہیں۔۔۔ ڈاکٹر محمود غازی کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ سیکولرازم کا لازمی تقاضا اور منطقی نتیجہ ہے۔ ہماری ناقص رائے میں اگر مغربی طاقتیں خلوص دل سے سیکولرازم کی حقیقی روح پر بھی عمل کرتیں تو بداخلاقی اور بے انصافی پر مبنی جس ظالمانہ اور مجرمانہ رویے کا، یہ قوتیں ارتکاب کرتی رہی ہیں، اس سے خاصی حد تک بچا جا سکتا تھا۔ المیہ تو یہ ہے کہ ان کے ہاں کفر بھی کفر نہیں ہے، سیکولرازم بھی خالص نہیں ہے۔ ہر ہر مرحلے اور مقام پر تفریق، منافقت اور دو عملی کارفرما ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے، اور یہ باعث عبرت بھی ہے کہ انصاف، مساوات، امن اور انسانی حقوق کا علم بردار اور مشعل بردار (torch bearer) ہونے کا دعویٰ بھی انھی کو ہے۔ جنگ عظیم اول کے بعد انجمن اقوام (League of Nations) قائم ہوئی، مگر انھی بڑی اقوام کی خود غرضیوں، مفاد پرستیوں اور ہوس رانیوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ علامہ اقبالؒ کو بجا طور پر کہنا پڑا:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن وزدے چند
بہر تقسیم قبور، انجمنے ساختہ اند

اور انجمن اقوام متحدہ (U.N.O) کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اور انجام بھی شاید ویسا ہی ہو گا کیوں کہ "جن اسباب کی وجہ سے انجمن اقوام کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، وہ تمام، پہلے سے کہیں زیادہ ڈھٹائی کے ساتھ ادارہ اقوام متحدہ میں موجود ہیں"۔۔۔ یعنی: ع مری تعمیر میں مضمر "ہے" اک صورت خرابی کی۔ چنانچہ فاضل مولف کا یہ احساس بالکل بجا ہے کہ مغربی قانون بین الاقوام کے مزاج اور ساخت میں مغرب کی بالادستی، طاقت کی پرستش اور مسلمانوں کی تذلیل و توہین کے عناصر شامل ہیں۔ اس قانون کے تحت جو ادارہ بھی بنے گا، وہ کبھی بھی کسی کمزور مسلمان ملک کو طاقت ور غیر مسلم (بالخصوص مغربی) ملک کے مقابلے میں انصاف فراہم نہیں کر سکے گا۔ یہ ادارے صرف مسیحی مغرب کے مفادات کی تکمیل کے لیے وجود میں لائے جاتے ہیں (ص ۳۵۲-۳۵۳)۔

۵۔ جہاد کا ایک اصول یہ ہے کہ فقہا کے نزدیک وہی جہاد اور وہی جنگ جائز تصور ہو گی جو حکومت وقت کی سربراہی میں دستوری اور آئینی طریقے سے کی جائے (ص ۲۶۸، ۲۶۹)۔ چنانچہ دور حاضر کے بعض حلقے افغانستان، کشمیر، بوسنیا اور چیچنیا وغیرہ میں مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں دفاعی عملی کارروائیوں کو جہاد کے بجائے فساد قرار دیتے ہیں۔ جناب محمود غازی نے فقہا کے اقوال کی روشنی میں جہاں اصول جنگ و جہاد کی بڑی عمدگی سے وضاحت کی ہے، وہاں اس کے عملی اطلاق کے سلسلے میں بھی متوازن اور معقول رائے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ جہاد کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے

لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو مقبوضہ علاقے کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود اپنے امیر کا انتخاب کر کے جہاد شروع کر دیں' جیسا کہ کشمیر میں ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان کے مسلمان ان کشمیری قائدین کی قیادت میں جہاد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بوسنیا اور چیچنیا میں بھی مسلمان' وہاں کی قیادت کے تحت جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں (ص ۲۸۱)۔

۶- طاقت ور قومیں مسلمانوں کے بارے میں اپنے اہداف کو تو پوشیدہ رکھتی ہیں مگر مسلمانوں کی حقیقی قوت' عزائم اور منصوبوں کے متعلق وہ اخبار نویسوں یا سروے کمپنیوں کے ذریعے ضروری معلومات و حقائق برابر جمع کرتی رہتی ہیں--- مصنف کی تلقین ہے کہ اس معاملے میں مسلم زعما کو بھی احتیاط کرنی چاہیے' مثلاً: دہلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کی طرح کے عزائم پر مبنی جذباتی انداز گفتگو دشمن کو چوکنا کرنے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنا ایک دلچسپ تجربہ بیان کیا ہے' کہتے ہیں:

> مجھے مارچ ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کے دورے کا موقع ملا۔ میرے ساتھ اس وقت کے پاکستان کے چیف جسٹس بھی تھے جو وفد کے سربراہ تھے۔ ہمیں وہاں کے ذمہ دار افراد سے گفتگو کا موقع ملا۔ اس وقت تک ازبکستان سوویت یونین کا حصہ تھا۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ اپنے مسلمان طالب علموں کو ہمارے یہاں داخلہ لینے کی اجازت دے دیں جسے انھوں نے ٹھکرا دیا اور اس کے جواب میں انھوں نے ایک بڑی ضخیم فائل دکھائی جس میں پاکستان کے بہت سے مذہبی و سیاسی لیڈران کرام کے بیانات تھے جن میں دعوے کیے گئے تھے کہ وہ سمرقند و بخارا پر پاکستانی پرچم لہرائیں گے۔ سوویت یونین کے ذمہ داران کا موقف تھا کہ آپ سوویت یونین کے اندرونی حالات خراب کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنے طلبا کو آپ کے یہاں داخلہ لینے کی اجازت نہیں دے سکتے (۳۰۸-۳۰۹)۔

۷- پاکستان میں قادیانیوں کی شہریت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں محمود غازی صاحب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چونکہ قادیانیوں کا بنیادی عقیدہ ناموس رسالتؐ کے منافی اور اسلامی اسٹیٹ سے بغاوت پر مبنی ہے' اس لیے اس کا صحیح حل (انھیں محض غیر مسلم اقلیت قرار دینا نہیں بلکہ) ان پر مکمل پابندی لگانا ہے۔ کیمونسٹ پارٹی اور عوامی لیگ وغیرہ کی طرح ان پر بھی مکمل پابندی لگا کے' ان کا سارا لٹریچر ضبط کرنا چاہیے۔ کیمونسٹ ملک میں وہاں کے بنیادی نظریات کے خلاف بات کرنا اگر اسٹیٹ کے خلاف جرم ہے تو یہاں بھی ریاست کی بنیادی اساس کے خلاف بات کرنا جرم ہونا چاہیے (ص ۳۳۸)۔

۸- آخری خطبہ: "مسلم اقلیت' جدید لادینی ریاستوں میں" بہت دلچسپ' فکر انگیز اور معلومات افزا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بطور اقلیت آباد و مقیم مسلمان دنیا کی کل مسلم آبادی کا چالیس فی صد ہیں۔ یہ

مسلمان لادین ریاستوں خصوصاً امریکہ و یورپ میں اپنی تعلیم، ہنرمندی اور علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں اختصاص رکھنے کے سبب بہت مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے باعث مسرت و اطمینان بھی ہے اور باعث عبرت بھی۔۔۔ خوشی کا باعث تو یوں کہ ایسے ماہر مسلمان اپنے اپنے ممالک کو زرمبادلہ وغیرہ کی صورت میں تو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر، اگر انھیں مناسب موقع ملے تو وہ امت مسلمہ کو کہیں زیادہ اور بیش بہا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں غازی صاحب نے ایک واقعہ سنایا ہے کہ یورپ کے ایک بہت بڑے ملک میں آج سے اٹھارہ سال پہلے مسلمانوں کا ایک وفد گیا اور اس نے ایک اہم جدید ٹکنالوجی کی منتقلی کی درخواست کی کیوں کہ وہ ٹکنالوجی اس مسلم ملک کے پاس نہ تھی۔ لیکن ایک بڑی طاقت کے اشارے پر اس میزبان ملک نے وہ ٹکنالوجی مسلمانوں کو منتقل کرنے سے انکار کر دیا۔ جس صبح اس وفد کو واپس روانہ ہونا تھا اس سے ایک رات پہلے میزبان ملک نے مہمانوں کے اعزاز میں الوداعی عشایئے کا اہتمام کیا، جس کے بعد کچھ لوگ چہل قدمی کے لیے نکلے۔ مسلم وفد کے سربراہ نے خود مجھے بتایا (وہ اپنے ملک میں ایک اہم اور بڑے سائنس دان تھے) کہ وہ لوگ عشایئے کے بعد چہل قدمی کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے، گفتگو کرتے کرتے میزبان ملک کے ایک سائنس دان نے موقع پا کر، اپنے ساتھیوں سے ذرا الگ ہو کر کہا کہ آپ اس انکار اور حکومتی فیصلے کو بھول جایئے، میں اس ادارے کا سربراہ ہوں اور میں مسلمان ہوں۔ میں یہ پوری ٹکنالوجی آپ کے ملک کو منتقل کر دوں گا۔ چنانچہ وہ ٹکنالوجی منتقل کر دی گئی۔ ایک فرد نے اپنی حکومت کی پالیسی کے خلاف اور ایک بڑی طاقت کے دباؤ کے باوجود اپنی جان اور اپنی اولاد کے لیے خطرہ مول لے کر، ایک مسلم ملک کو وہ فائدہ پہنچا دیا جو عام حالت میں ممکن نہ تھا۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں، لیکن اس ایک مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم ممالک کے لیے مسلم اقلیتوں کی کتنی اہمیت ہے۔ مگر مسلم اقلیتیں منظم نہیں ہیں اور کوئی مسلمان ملک ان کا سرپرست نہیں ہے۔ ان کی مناسب تنظیم اور تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ دوسری طرف صرف ڈیڑھ کروڑ یہودیوں نے پورے امریکہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے: ع فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں اس سپرپاور کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں، مگر امریکہ میں مقیم ساٹھ لاکھ مسلمان بے بس ہیں۔ وہاں تبلیغ اسلام کے لیے خداداد مواقع حاصل ہیں۔ امریکی حکومت جیلوں میں مقید کالوں کو قابو میں رکھنے سے عاجز آچکی تھی مگر جوں جوں کالے مسلمان ہوتے گئے تو بدلتے گئے۔ ضدی، اکھڑ اور غارت گر کالے، اسلام قبول کرنے کے بعد خاموش، نظم و ضبط کے پابند اور تعاون کرنے والے بن گئے۔ حکومت کے تحقیقاتی کمیشن نے رپورٹ دی کہ مجرم قیدیوں کو مہذب بنانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ ممکن نہیں کہ انھیں قبول اسلام کی رغبت دلائی جائے۔ غازی صاحب کہتے ہیں کہ مجھے ۱۹۸۹ میں وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو جیلوں میں تبلیغ کرنے

والوں نے بتایا کہ خود صدر بش کے حکم سے ہر جیل میں مسلمان مبلغ مقرر کیے گئے ہیں اور جیلوں میں حکومت کے خرچ پر مساجد بنائی جا رہی ہیں۔

مسلم اقلیتوں کو غیر مسلم معاشروں میں درپیش مسائل میں مدد دینا' مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی ذمہ داری ہے مثلاً:

۱۔ ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کے لیے آواز اٹھائی جائے (بلجیم میں ۱۹۷۴ء کے اوائل سے اسلام کو سرکاری مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے کیوں کہ مقامی آبادی کی خاصی تعداد اسلام قبول کر چکی ہے۔ اب اگر کسی مقام پر مسلم آبادی مطالبہ کرے تو حکومت قانوناً مسجد بنا دینے کی پابند ہے بلکہ وہ امام کی تنخواہ بھی دے گی) (ص ۴۰۰)۔

۲۔ تارکین وطن کے لیے تعلیم اور تہذیب و تربیت کا بندوبست کیا جائے خصوصاً معقول تعداد میں ایسے جدید تعلیم یافتہ اور معتدل نقطہ نظر کے حامل اہل علم کی تیاری و فراہمی' جو تارکین وطن کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ' مساجد کو اختلاف و جدال کا اکھاڑا بنانے کے بجائے' مرکز رشد و ہدایت بنائیں۔

بلاشبہ مسلم اقلیتیں تعاون' مدد اور رہنمائی کی مستحق ہیں۔ مگر ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلم اکثریت کے درمیان اور لادینی معاشروں میں رہتے ہوئے حکمت و تدبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ جزائر غرب الہند کے ملک ٹرینی ڈاڈ میں بعض پرجوش مسلمانوں نے اپنی بے تدبیری اور حماقت سے امت مسلمہ کے لیے رسوائی کا سامان فراہم کیا اور اسلام کی پیش رفت کے لیے راستہ مسدود نہیں کیا تو اس راستے میں کانٹے ضرور بو دیے۔ ڈاکٹر محمود غازی بتاتے ہیں کہ وہاں مسلمان ۱۵ یا ۱۶ فی صد ہیں۔ وہاں مسلمانوں کو اتنا اثر و رسوخ حاصل تھا کہ اقلیت ہونے کے باوجود ملک کا صدر مسلمان تھا۔ پارلیمنٹ کا سپیکر اور عدلیہ کا چیف جسٹس بھی مسلمان تھے البتہ وزیراعظم کا عہدہ ایک عیسائی کے پاس تھا۔ کہیں سے کچھ مخلص اور پرجوش مگر کم علم اور حکمت و تدبر سے عاری مسلمان مبلغین وہاں پہنچے اور مقامی مسلمانوں کو بھڑکایا کہ جنگ بدر میں ۳۱۳ مسلمانوں کی قلیل تعداد' تین گنا سے زائد کافروں پر غالب آ گئی تھی۔ یہاں بھی کفر کو شکست دے کر اسلامی انقلاب برپا کر دینا چاہیے۔ پھر کیا تھا بعض کالے پرجوش مسلمانوں نے مسلم املاک کو نقصان پہنچایا' ٹی وی اور ریڈیو پر قبضہ کر لیا اور نفاذ اسلام کا اعلان کر دیا مگر اسلام تو وہاں کیا قائم ہوتا' غیر مسلم اکثریت سے مسلمانوں کے خیر سگالی کے تعلقات بھی ختم ہو گئے' وہ کلیدی عہدے بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور تبلیغ اسلام کے لیے آیندہ راستے بند ہو گئے۔ یہ نتیجہ تھا چند نادان دوستوں کی بے تدبیری کا۔ "ان کے جوش جنوں نے وہ کام کر دیا جو ان کے غیر مسلم دشمن بھی نہ کر سکے تھے" (ص ۳۹۸)۔

۳۔ مختلف یورپی طاقتیں' صدیوں تک افریقہ و ایشیا اور لاطینی امریکہ کے مختلف علاقوں پر متصرف رہیں۔ انھوں نے اپنی اپنی نوآبادیات کو مختلف حیلوں بہانوں سے' جی بھر کے لوٹا۔ بہ قول : مصحفی (۱۷۵۰-۱۸۲۶) :۔

ہندستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدریج کھینچ لی

دور جدید میں اس طرز کی تاخت و تاراج کی تو ممکن نہیں رہی۔ اب ان فرنگیوں نے عالمی بنک اور آئی ایم ایف وغیرہ کے لبادے اوڑھ لیے ہیں---- اب المیہ یہ ہے کہ مشرق خصوصاً مسلم معاشرے کی ذہانت اور مہارت' مغربی دنیا برابر کھینچے لیے جا رہی ہے اور حال میں تو اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ مسلمان اپنے قیمتی وسائل سے ڈاکٹر' انجینئر اور مختلف شعبوں کے ماہرین تیار کرتے ہیں' مگر یورپ اور امریکہ و کینیڈا انھیں فوراً سنبھال لیتے ہیں۔ ان کی قابلیت و مہارت (talent) اغیار کے کام آ رہی ہے:۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

(اے غنی' پیر کنعاں [یعقوب] کی بد قسمتی ملاحظہ ہو۔ اس کا نور چشم [بیٹا یوسف] زلیخا کی آنکھ روشن کر رہا ہے)۔

۴۔ جناب محمود غازی مسلم ممالک کو توجہ دلاتے ہیں کہ اس ذہانت و خدمت سے غیروں کے بجائے' خود ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے بلکہ اگر ہم اسلامی اخوت اور وحدت کی بنیاد پر مسلمان ممالک میں سازگار فضا اور مناسب ماحول پیدا کریں تو یورپ اور امریکہ و کینیڈا میں موجود ان ہزاروں مسلمان ماہرین کو اپنے ہاں بلا کر ان سے دنیاے اسلام کی خدمت کا کام لے سکتے ہیں' جو دوسروں کے اخراجات سے تیار ہوئے ہیں (ص ۳۹۱)۔ مگر اس کے لیے نیک نیتی' خلوص اور بڑی حکیمانہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ بطور خاص حکومتی نظاموں کو بدعنوانیوں اور بے انصافیوں سے پاک کیے بغیر' ہم ذہانت و مہارت کو اپنے ہاں نہیں کھینچ سکتے۔

جناب مصنف کہتے ہیں کہ اگر مسلم ممالک نے' غیر مسلم اقلیتوں کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کیں تو خدا نہ کرے کہ وہ غیر مسلم اکثریت کے درمیان اپنا ملی تشخص کھو بیٹھیں اور وہ سپین میں مسلمانوں کے سے انجام دوچار ہوں۔

ڈاکٹر محمود غازی کے یہ خطبات پڑھتے ہوئے ذہن' علامہ اقبالؒ کے ایک احساس کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ تقریباً پون صدی قبل انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے' اس لیے زمانہ حال کی فقہ (قوانین) پر تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرنا' مسلمانوں کی

اہم ترین ضرورت ہے--- (اقبال نامہ' اول' ص ۵۰-۵۱)۔ دور جدید کے تناظر میں اسلام کی تفہیم و تعبیر اور بطور خاص اسلامی قانون اور فقہ کی توضیح و تشریح کے ضمن میں یہ خطبات' ایک قابل قدر کاوش اور پیش رفت ہیں۔ ان میں اصل موضوع کے ذیل میں بیسیوں ضمنی مسائل و مباحث آگئے ہیں' جیسے: دارالاسلام' دارالحرب' جزیہ' سفارت کاری' ڈپلومیسی' ثالثی' گفت و شنید اور مذاکرات' معاہدات' شہریت' توہین رسالت' دور جدید میں احیاے خلافت' اہل ذمہ' اہل کتاب' مرتدین وغیرہ۔ غازی صاحب نے دقیق بحثوں میں علم اور مطالعے کو اپنے تجربات و مشاہدات کی آمیزش سے ایسا دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے کہ انٹرنیشنل لا کے طلبہ کے علاوہ مسائل امت سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین بھی کتاب سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

اسلامیہ یونی ورسٹی سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ زیر نظر خطبات کا آیندہ ایڈیشن' اغلاط کتابت و املا کی درستی کے بعد' اور اشاریے کے اضافے کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ (قیمت: ۲۹۰ روپے مجلد' ۱۴۰ روپے کاغذی جلد)

رسائل و مسائل

عشر کے جدید مسائل

سوال: عشر کے سلسلے میں فقہ حنفی کے احکام تو بہت واضح ہیں لیکن عصر حاضر میں کچھ پیچیدہ سی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ میرے خالہ زاد بھائی ایک صاحب ایمان فرد ہیں۔ دو ڈھائی ایکڑ زرعی اراضی کے مالک ہیں اور باقاعدگی سے عشر نکالتے ہیں۔ گذشتہ دنوں انھوں نے عشر کے تعین کے سلسلے میں اپنی صورت حال سامنے رکھی تو ہم جواب دینے میں مخمصے کا شکار ہو گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو پیداوار حاصل کی ہے اس پر پانی کے علاوہ عمدہ قسم کا بیج، مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات خریدنے اور اجرت پر ٹریکٹر کے ذریعے ہل چلانے اور اجرت پر ہی تھریشر کے ذریعے گندم اور بھوسہ الگ کروانے کے اخراجات ہوئے۔ اب انھیں کس شرح سے عشر ادا کرنا چاہیے، اس پس منظر میں کہ رسولؐ اللہ نے پانی کے اخراجات کے باعث شرح میں تبدیلی فرمائی؟ دوسرا ان کا یہ کہنا ہے کہ جتنی گندم کھیت سے اٹھا لایا ہوں اس سے سال بھر کی اناج کی ضروریات پوری کرنی ہیں اور اگلی فصل کے لیے اخراجات (ہل بذریعہ ٹریکٹر سپرے، نئی اقسام کے بیج کی خریداری، کھیت کی صفائی کے لیے لیبر کا حصول) بھی اسی سے پورے کرنے ہیں، اور ان اخراجات کے بغیر چارہ نہیں کہ یہ واحد ذریعہ معاش ہے۔ اس سب کچھ کرنے کے بعد بچتا کچھ نہیں بلکہ کچھ قرض وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اب ان صاحب نے اخراجات الگ کر کے، دس فی صد کی شرح سے عشر ادا کر دیا ہے۔ فصلوں کی موجودہ صورت حال جس میں تجارت کی طرح پہلے بہت کچھ لگانا پڑتا ہے، عشر کی ادائیگی کے بارے میں اہل فقہ کیا فرماتے ہیں؟ بندہ دہقان کے اوقات تو بہت تلخ ہو چکے۔

جواب: جدید مشینی آلات اور کھاد وغیرہ کے ذریعے زراعت میں جہاں اخراجات اٹھتے ہیں وہاں اس کے ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مستند بات یہ ہے کہ اخراجات کو ادا کرنے کے بعد اگر زمیندار صاحب استطاعت ہو اور وہ اس پیداوار سے جو اسے حاصل ہوتی ہے، استطاعت رکھتا ہو کہ اپنے اخراجات آسانی سے پورے کر سکے اور وہ کل پیداوار سے، اخراجات کو منہا کیے بغیر عشر دینے کی سکت رکھتا

ہو تو کل پیداوار سے عشر ادا کرے۔ اگر زمیندار چھوٹی سطح کا ہو، اخراجات منہا کیے بغیر عشر دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اتنی پیداوار حاصل نہ کی ہو کہ آسانی سے اپنے اخراجات بھی پورے کر سکے اور کل پیداوار میں سے عشر بھی ادا کر سکے تو پھر اخراجات منہا کر کے باقی کا عشر نکال لے۔ یہ درمیانی راہ ہے جو قرآن پاک کی عمومی ہدایات اور عشر کے احکام دونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ عمومی ہدایت تو یہ ہے کہ زکوٰۃ اغنیا سے وصول کی جائے اور فقرا کو دی جائے اور عشر کا اصول یہ ہے کہ جو پیدا ہو اس میں سے عشر دیا جائے۔

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ پانی کے اخراجات کو تو شریعت نے اس طرح مستثنیٰ کر دیا ہے کہ دسویں کے بجائے بیسواں حصہ مقرر کر دیا ہے۔ پانی کے علاوہ باقی اخراجات کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ لہٰذا اس میں دونوں پہلوؤں کی گنجایش ہے یعنی مستثنیٰ کرنے اور نہ کرنے کی۔ مستثنیٰ نہ کرنے کا پہلو ان لوگوں کے لیے مناسب ہو گا جو سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں۔ ان پر اس سے کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔ ادایگی کے بعد بھی وہ اپنا گزارہ خود کر سکیں گے اور دوسروں کے محتاج نہ ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الصدقة عن ظهر غنى**، "صدقہ مال دار پشت سے ہے"۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اخراجات کو مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ہو جب کہ زمیندار غریب ہو، صاحب استطاعت نہ ہو اور اخراجات کو منہا نہ کر کے بوجھ تلے دب جائے۔ اسے دوسروں کی طرف سوال کے لیے رجوع کرنا پڑے اور قرض اٹھانا پڑے۔ اس کی دلیل بھی مذکورہ حدیث ہے، **الصدقة عن ظهر غنى** ــــ یہ چونکہ غنی نہیں ہے لہٰذا اس پر صدقہ نہ ہو گا۔ (**مولانا عبدالمالک**)

قرآن کی تعلیم اور جنس کے مسائل

س: بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ دو سال پہلے خیال آیا کہ کیوں نہ اردو پر عبور رکھنے والے بچوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھنے کی طرف راغب کیا جائے۔ یہ سلسلہ شروع ہو بھی گیا۔ تذکیر کے حوالے سے اور عمومی انداز فکر کی تشکیل کے حوالے سے، یہ بچوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل چیز ہے۔ اب خیال آیا ہے کہ قرآن میں دلائل و براہین کے سلسلے میں خاصے مقامات ایسے آتے ہیں جہاں ایسے معاملات کا تذکرہ ہوتا ہے جو سن بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۹ سے ۱۲ سال کی عمر تجسس اور زندگی کے حیوانی حقائق کے سلسلے میں پراگندہ خیالی کی ہوتی ہے۔ کیا ان آیات کے ذہنوں پر منفی اثرات نہیں پڑیں گے؟ پھر سوچتا ہوں کہ قرآن تو ہر جگہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اسے حضورؐ کے عہد سے متصل حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح میں مکمل سنا جاتا رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی شمولیت پر تراویح میں پابندی تو نہیں ہو گی۔ اب فرمایئے کہ مجھے کیا

کرنا چاہیے؟

ج: قرآن پاک میں جن معاملات کا سن بلوغت سے تعلق ہے، ان کو اس قدر وہ بچہ سمجھ سکتا ہے جس قدر بچے کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے اور جو ترجمے کو سمجھنے کی عمر کو پہنچ چکا ہو۔ قرآن پاک ایسی زبان استعمال نہیں کرتا جس کو سمجھنے کے لیے بلوغت ضروری ہو۔ جنس سے متعلق آیات میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کو پڑھنے سے بچوں پر منفی اثرات پڑتے ہوں۔ فلسفہ اور چیز ہے اور تجربہ دوسری چیز۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن پاک کے پڑھنے سے منفی اثرات کبھی بھی نہیں پڑے۔ اس لیے قرآن پاک ہر عمر کے بچے کے سمجھنے کے لیے مناسب ہے۔ اس لیے آپ بچوں کو ترجمہ پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ (ع - م)

تنسیخ نکاح کا مسئلہ

س: ہمارے محلے کے لڑکے کا نکاح یہاں سے ستر کلومیٹر دور، اس کی خالہ زاد بہن کی بیٹی سے ہوا۔ نکاح کے علاوہ خیر سگالی کے طور پر کپڑے اور سامان خورد و نوش بھی لڑکی والوں کو دیا گیا۔ بعد ازاں لڑکی والوں نے وٹہ کے طور پر رشتہ اور خاصی رقم کا مطالبہ کر دیا۔ جب لڑکے والوں نے مطالبات پورے نہ کیے تو لڑکی کے والدین نے تنسیخ نکاح کا دعویٰ قریبی عدالت میں، اس حالت میں دائر کر دیا کہ ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔ عدالت نے بذریعہ نوٹس لڑکے کو طلب کیا۔ لڑکا اس خیال سے عدالت میں نہ گیا کہ اس طرح تعلقات میں مزید خرابی آئے گی۔ اب پتا نہیں عدالت نے کیا دلیل قائم کی کہ تنسیخ نکاح کا فیصلہ سنا دیا اور لڑکی کسی اور جگہ بیاہ دی گئی۔ کیا واقعی نکاح منسوخ ہو گیا ہے یا عدالت کو معاملات پر غور کا موقع نہیں مل سکا؟ شریعت اسلامی بالخصوص فقہ حنفی کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

ج: نکاح کو فسخ کرنے کی شریعت میں شرائط ہیں۔ اگر کوئی عدالت ان کو نظرانداز کر کے نکاح فسخ کرے گی تو نکاح فسخ نہیں ہو گا۔ اس لیے ایسی صورت میں دوسری جگہ نکاح کرنے کے لیے شوہر سے طلاق حاصل کرنی چاہیے۔ لڑکے کو عدالت میں حاضری دینا چاہیے تھی۔ اس نے عام بلاوے پر حاضری نہیں دی تھی تو اسے وارنٹ کے ذریعے بلایا جانا چاہیے تھا اور جواب دعویٰ سننے کے بعد تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کی جانی چاہیے تھی۔ اب لڑکے کو چاہیے کہ بالائی مجاز عدالت میں اپیل دائر کرے، یا وفاقی شرعی عدالت میں جج کے فیصلے کو غیر شرعی قرار دینے کی درخواست دے۔ نیز ساری تفصیلی صورت حال لکھ کر اور جج صاحب کے فیصلے کی نقل کو اس کے ساتھ منسلک کر کے علما سے بھی استفسار کرے۔ واللہ اعلم! (ع - م)

انتقال خون میں مرد عورت کی تمیز

س: براہ راست کسی کتاب سے تو نہیں پڑھا اور نہ کسی مستند عالم سے سنا ہے لیکن ہمارے ہاں عمومی طور پر یہ بات مشہور ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے کسی عورت کو کسی غیر محرم مرد کا جوٹھا کھانا پینا وغیرہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر انتقال خون کے سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں جب کہ یہاں غیر محرم مردوں کا خون عورتوں کو منتقل کیا جاتا ہے بلکہ اس سلسلے میں کوئی ایسا انتظام ہی نہیں کہ بلڈ بنک سے معلوم ہو سکے کہ موجود خون مرد کا ہے یا عورت کا۔ فرمائیں کیا کیا جانا چاہیے؟

ج: کسی کا جوٹھا استعمال کرنا طبیعت میں دوسرے کی طرف میلان اور جذبات میں خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ انتقال خون میں ایسا نہیں ہے۔ انتقال خون میں تو ایک مریض کے جسم میں ایک دوسرے آدمی کے خون کو بطور دوا داخل کیا جاتا ہے۔ جس میں لذت یا جذبات کے میلان کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خون تو ایک اضطراری حالت میں منتقل کیا جاتا ہے۔ جوٹھا کھانا کے استعمال کے لیے بھی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو اس کی بھی اجازت دے دی جائے گی۔ نیز غیر محرم مرد کے جوٹھے کا استعمال ناجائز نہیں ہے بلکہ اسلامی تہذیب اور آداب کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا' اس لیے خلاف اولیٰ ہے' ناجائز نہیں ہے۔ (ع - م)

زیر تصرف تحریکی امانتیں

س: جماعت اسلامی میں جو امانتیں ہمارے زعما اور قائدین کے سپرد کی جاتی ہیں مثلاً ٹرانسپورٹ میں موٹر سائیکل' کار وغیرہ اور ٹیلی فون کی سہولت جو کہ تقریباً ہر دفتر میں موجود ہے' اس کے استعمال کا کیا طریق کار ہے؟ آیا ٹرانسپورٹ اور ٹیلی فون وغیرہ کچھ حد تک اپنے ذاتی استعمال میں بھی لایا جا سکتا ہے یا مکمل اجازت ہے یا بالکل اجازت نہیں۔ کیا حدود مقرر ہیں؟ میرا دل بے چین ہے اور میں آپ سے اطمینان قلب کے لیے استفسار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس حوالے سے مرکزی مجلس شوریٰ نے بھی کوئی پالیسی اپنائی ہے یا یہ معاملہ کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے؟ اگر اس معاملے میں مرکزی شوریٰ کا کوئی سرکلر وغیرہ موجود ہو تو وہ آپ مجھے ارسال فرمائیں یا خود ہی مجھے جماعت کے فیصلے سے آگاہ فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔

ج: جماعت اسلامی جیسی تنظیم، یا کسی پبلک ادارے، یا ریاست کی جو امانتیں ذمہ دار، عہدے داروں اور کارکنوں کے سپرد کی جاتی ہیں، ان کے بارے میں کوئی ایسی پالیسی یا فارمولا بنانا ممکن نہیں۔ میرے علم میں مرکزی مجلس شوریٰ کا کوئی فیصلہ یا سرکلر نہیں۔ اس لیے نہیں کہ یہ معاملہ کسی اہمیت کا حامل نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ معاملہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ یقینی ہے کہ اس بارے میں عمومی پالیسی سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیے۔ خصوصاً ان اشخاص کو جو خلفاے راشدین کی زندگی کے واقعات سن سن کر تربیت پاتے ہیں۔

امانت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا ظاہر ہے کہ جائز نہیں۔ اور یہ عمومی اصول مشہور و معروف ہے۔

لیکن اس کے عملی انطباق کی صورتیں اتنی مختلف اور متنوع ہوتی ہیں کہ ان کو کسی ایک فیصلے یا سرکلر میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ اس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے بھی ہو گا، اور بعض صورتوں میں شخص کے ضمیر پر بھی چھوڑا جائے گا۔ ہر ایک کے لیے ایک قسم کی حدود نہیں بنائی جا سکتیں۔

پبلک مال، مال یتیم کی مانند ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید نے بھی عمومی اصول ہی بیان کیا ہے کہ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ (النساء ۴:۶)، یعنی جو غنی ہے وہ نہ لے، جو نادار ہے وہ معروف کے مطابق کھالے۔ غنی کی کیا تعریف ہے؟ وہ کہاں تک اپنے کو بچائے اور نہ لے؟ فقیر کون ہے؟ وہ کتنا کھائے؟ ظاہر ہے کہ یہ تفصیلات کوئی قانون فراہم نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی جز وقتی ملازم ہے، مثلاً ۹ سے ۴ تک کا، ظاہر ہے کہ اس کو اپنی تنخواہ اور طے شدہ سہولتوں سے زیادہ کا حق نہیں۔ اگر ہنگامی حالت ہو تو وہ استعمال کر سکتا ہے، فون بھی، گاڑی بھی۔ اگر قیمت ادا کر سکتا ہے تو کرنا ضروری ہے۔ اگر اتنا نادار ہے، تنخواہ اتنی کم ہے کہ نہیں دے سکتا، تو ادارے کا فرض ہے کہ نہ لے۔

جو ہمہ وقتی کارکن ہے، ملازم نہیں۔ بازار کے مطابق تنخواہ نہیں لیتا، بلکہ صرف زر کفالت وصول کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جماعت کو اس کو ذاتی ضروریات کے لیے استعمال کی اجازت دینا چاہیے۔ وہ اگر پیدل بازار سے سودا لینے جائے گا، تو بہت وقت لگے گا۔ جماعت کے کام کا ہی نقصان ہو گا۔ خود جانے کے بجائے فون استعمال کرے گا، یا معاون کو بازار بھیج دے گا، تو جماعت ہی کا بھلا ہو گا۔

ضروری ہے کہ ہر معاملہ شفاف ہو۔ جماعت شروع میں واضح کر دے کہ کیا اور کتنے استعمال کی اجازت ہے۔ یہ سب پر واضح ہو۔ ممکن ہو تو تحریر میں آ جائے۔ اس سے استعمال کرنے والے کا ضمیر بھی پاکیزہ رہے گا، اپنے آپ کو مجرم محسوس نہ کرے گا یا بے حس نہ ہو جائے گا۔ دوسرے بھی بدگمانی اور تہمت سے بچ جائیں گے۔ خصوصی ضروریات اٹھیں تو بھی جو کچھ ہو وہ معروف، معلوم اور اجازت سے ہو۔ جماعت کو بھی کھلے دل کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔ استعمال کنندہ کو بھی کم سے کم استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح ایک معقول، خوش گوار اور منصفانہ معاملہ ہو سکتا ہے۔

جو ہمہ وقتی کارکن نہ ہو، لیکن جماعت کا کارکن ہو، اس کی بھی ناگزیر ضروریات کے لیے جماعت کو اجازت دینا چاہیے۔ اور وہ خود اگر اس کی قیمت ادا کر سکتا ہو تو کر دینی چاہیے۔ میں کبھی ہمہ وقتی کارکن نہ رہا۔ اچھے عہدے اور اچھی تنخواہ پر ملازم تھا۔ اپنی موٹر، اپنا سفر خرچ، اپنی ہر چیز جماعت کے لیے تھی۔ دن بھر اپنی ملازمت کر کے جماعت کے دفتر جاتا تھا۔ دفتر کا معاون میرا سودا سلف لا دیتا، خود جاتا تو جماعت کے کام کا ہرج تھا۔ اس کی اجازت بھی میں نے شوریٰ سے لی تھی۔ اب میں جہاں جہاں حساب کر کے ادا کر سکتا ہوں وہ کر دیتا ہوں۔ کچھ رقم علی الحساب بیت المال میں جمع کرا دیتا ہوں کہ فون، اسٹیشنری، ڈاک میں جو ذاتی خرچ ہو اس میں ادا ہو جائے۔ اپنی اعانت میں بھی یہ نیت کر لیتا ہوں کہ پہلے جماعت کا حق ادا ہو۔ لیکن یہ ہر ایک کے لیے ضروری نہیں۔ جو afford نہ کر سکتا ہو، وہ ذاتی استعمال کرے۔ کم سے کم کرے، ناگزیر ضروریات کے لیے کرے اور اجازت لے لے۔ (خرم مراد، جون ۱۹۹۴)

کتاب نما

بلوچستان، آزادی کے بعد، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، انور رومان۔ ناشر: مشاورہ تعلیمی تحقیق، ۲۷-۲، اے، او بلاک III، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ۔ صفحات: ۶۲۴۔ قیمت: ۵۰۰ روپے۔

پاکستان کے علمی حلقوں میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ عمر بھر تعلیم و تدریس میں مشغول رہے، بلوچستان کے دور دراز گوشوں کو علم و تعلیم کی شمع سے منور کیا، اردو زبان کا علم بلند کیا، ادب، تعلیم، تاریخ اور صحافت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی اور اس کے نتیجے میں، درجنوں کتابیں تالیف و تصنیف کیں۔ اسلام، پاکستان، اردو اور تعلیم سے محبت اور دلچسپی ان کی شخصیت میں رچی بسی ہے۔ پروفیسر انور رومان بھی عالم و فاضل اور صاحب تصنیف معلم ہیں۔ زیر نظر کتاب دونوں اصحاب کی مشترکہ مساعی اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔

انگریز اپنے دور تسلط میں، حتی الوسع ہندستان کے مختلف علاقوں اور ضلعوں کے گزیٹیر برابر تیار کراتے رہے۔ گو، یہ ان کی انتظامی اور سیاسی ضرورت تھی مگر اب یہ مفید دستاویزات تاریخ کا اہم حوالہ بن چکی ہیں (ہماری کارکردگی کا عالم تو یہ ہے کہ دفاتر میں ماضی متصل کا ریکارڈ ندارد۔ اب گزیٹیر کی تیاری تو خواب و خیال بن چکی ہے، مگر مارے باندھے، کچھ نہ کچھ رپورٹیں، ناقص ہی سہی، تیار ہوتی رہتی ہیں)۔

زیر نظر کتاب میں بلوچستان کی تاریخ و جغرافیہ، افراد و اکابر، سیاست و معیشت، صنعت و حرفت، تعلیم و صحافت، ریلوے، سوئی گیس اور دوسرے بیسیوں شعبوں کے بارے میں ہر طرح کی معلومات، سرکاری و غیر سرکاری ذرائع سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ ایک طرح کا بلوچستان انسائیکلوپیڈیا ہے۔ مرتبین نے اس کی تیاری میں ۵، ۶ سال تک جس قدر محنت و کاوش کی ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

مصنفین کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ بلوچستان سے سرد مہری یا اسے نظرانداز کرنے کا شکوہ بے جا ہے۔ پاکستان کے دوسرے صوبوں کی بہ نسبت، بلوچستان میں ہر شعبے میں، زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں صوبے کا بجٹ ۴۰ لاکھ روپے تھا، ۱۹۹۷ میں ۱۲ ارب تک پہنچ گیا، مگر خرابی کیا ہے؟ پہلے ۹۵ فی صد کام ہوتا تھا اب ۵ فی صد کام ہوتا ہے۔ ”فنڈ کھانے کے نت نئے طریقے دریافت کیے جا رہے ہیں“۔ رقوم دیانت داری اور مہارت سے خرچ کی جاتیں تو تین گنا زیادہ ترقی ہوتی (تنزل کا ایک سبب قبائلی سردار اور ان کی باہمی رنجشیں اور جھگڑے بھی ہیں)۔ ہماری نااہلی کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کو چمن کے راستے

افغانستان سے ملانے والی ۱۸۹۱ کی تعمیر کردہ، فن تعمیر کا ایک شاہکار اور تاریخی نوعیت کی خوجک سرنگ بے توجہی کی وجہ سے انحطاط کا شکار ہے۔ جناب انور رومان نے سچّے کی بات کہی ہے: "اچھے، اہل اور راست کار انسان محدود وسائل سے بھی ملک و ملت کو بہت کچھ دے جاتے ہیں اور بڑے، نااہل اور غلط کار انسان لامحدود وسائل کو لوٹتے ہیں اور لٹاتے ہیں--- یہ ایک حقیقت ہے کہ زر و سیم کے انبار نہیں بلکہ انسان ہی کسی قوم کو عظمت و قوت دے سکتے ہیں" (ص ۲۲)۔ مصنفین، بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں بہت پرامید ہیں، تاہم وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا بلوچستان کے اکابر اور بلوچستان کی نژادِنو اپنی محنت، دل بستگی اور لگن کو دیگر مشاغل کے بجائے بلوچستان کی پیش رفت اور برخیزی کے لیے وقف کر سکے گی؟

پوچھتی ہے کشت بے آب و گیاہ
ابر گوہر بار کتنی دور ہے؟ (ص ۵۸۹)

(رفیع الدین ہاشمی)

پرواز فکر، کویت کی فضاؤں میں، حکیم محمد سعید۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن، ناظم آباد، کراچی۔ صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

یہ کتاب حکیم محمد سعید شہید کے سفر کویت (۱۹۹۷) کے دنوں کا روزنامچہ مسلسل یا تاثر نامہ ہے۔ اس میں کچھ تو "معذورین دماغی صحت کے لیے سامان صحت" کے عنوان سے منعقدہ ایک اجلاس کی روداد ہے جس میں کچھ تو اسی روداد کے حوالے سے، اور کچھ دوسرے حوالوں سے مصنف کی زندگی کے بعض واقعات، مشاہدات، تاثرات اور جذبات کا تذکرہ ہے جو دلچسپ، معلومات افزا اور سبق آموز ہے اور عبرت انگیز بھی۔ یوں یہ مختصر کتاب آپ بیتی ہے اور جگ بیتی بھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کو "ادھر ہم، ادھر تم" کا اعلان کر کے تقسیم کر دیا۔ ان کی وزیراعظم بننے کی "سفلی خواہش" نے پاکستان کو دولخت کر دیا (ص ۱۱۲)۔ اب پاکستان کی مزید تقسیم کا خدشہ بھی ہے۔ کچھ غیر ملکی ادارے، گلگت، سکردو، ہنزہ اور چترال میں "محو خدمت" ہیں۔ یہود و نصاریٰ تبدیلیوں کا نقشہ بنا چکے ہیں (ص ۹۳)۔

حکیم محمد سعیدؒ ہوس دولت کی سخت مذمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دولت سے محبت "ذہنی علالت" ہے اور محض دولت کے بل بوتے پر الیکشن میں کامیاب ہونے والا شخص ذہنی مریض۔ وہ افسوس کرتے ہیں کہ کسی معمولی کالج میں داخلے کے وقت امیدوار کی ذہنی صحت کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے، مگر انتخاب لڑنے والوں کو نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی ذہنی صحت کیسی ہے؟ ان کے خیال میں پاکستان کے لیے بڑے بڑے فیصلے کرنے والے اسمبلیوں اور پارلیمان کے ارکان اگر مفلوک الفکر اور مفلوج الذہن ہیں تو کیا ملی فرائض ادا کر

سکیں گے؟ انھوں نے جگہ جگہ نام نہاد مذہبی طبقے پر بھی تنقید کی ہے۔ ایک جگہ بتاتے ہیں کہ بھارت گیا تو معروف محقق اور عالم علامہ عرشی رام پوری سے ملنے کا اشتیاق تھا چنانچہ رام پور کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں مراد آباد پر عصر کا وقت ہو گیا۔ مسجد گیا تو اسے دھویا جا رہا تھا۔ پوچھا کیوں؟ بتایا گیا: "یہاں مولانا طیب صاحب (دار العلوم دیوبند) نماز پڑھ گئے ہیں' مسجد ناپاک ہو گئی ہے' مسجد دھوئی جا رہی ہے" (ص: ۷۶)۔

حکیم محمد سعیدؒ پاکستان کے حالات پر سخت مضطرب' بے چین اور فکر مند ہیں اور اصلاح احوال کے لیے بہت سی تجویزیں پیش کرتے ہیں' مثلاً: ○ سیاست کو ناجائز قابضین (زمینداروں اور وڈیروں) سے نجات دلائی جائے۔ ○ ہر نونہال کو لازماً تعلیم دی جائے اور معلمین کی قدر کی جائے۔ ○ انگلش میڈیم اسکول دشمنوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں' ان کو بند کیا جائے۔ ○ غیر ملکی غذائیں' مشروبات اور قرضے ممنوع قرار دیے جائیں۔ ○ کفایت' قناعت اور غربت کی زندگی اختیار کی جائے۔ ○ دن کا کھانا ختم' ایک ناشتہ اور ایک کھانا' یہی سنت و صحت کا راستہ ہے۔ ○ چائے اگر ناگزیر ہو تو دن میں صرف ایک پیالی' ایک چمچ چینی کے ساتھ۔ ○ وقت کو ضائع نہ کیا جائے۔

کویت کانفرنس آدھ گھنٹہ تاخیر سے شروع ہوئی جس پر حکیم صاحب کو سخت کوفت ہوئی' کہتے ہیں جو حضرات کبار جبوں قبوں میں ہیں' وہ سب کے سب تاخیر سے آئے حالانکہ انھی مدعیان اسلام کو وقت کا پابند ہونا چاہیے۔ (ر - ہ)

قائداعظمؒ کا تصور پاکستان اور ان کے اقوال' رضوان احمد۔ ناشر: فضلی سنز' اردو بازار' کراچی۔ صفحات: ۱۴۸۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

جناب رضوان احمد قائداعظمؒ اور تحریک پاکستان کے موضوع پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کے ابتدائی حصے میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ قائداعظمؒ کے لیے نہ تو سیکولرازم قابل قبول تھا نہ سوشلزم اور نہ کیمونزم۔ ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد اسلامی' سماجی انصاف کا قیام تھا۔ رضوان احمد کہتے ہیں کہ اسی لیے قائداعظمؒ نے واضح طور پر اعلان کیا کہ: "اسلامی اصول اسی طرح زندگی میں نافذ العمل ہیں جس طرح ۱۳ سو سال پہلے تھے" اور یہ کہ "پاکستان کے آئین کی بنیاد و اساس شریعت ہو گی"۔

اس کے بعد' جناب مصنف نے مختلف عنوانات (اسلام' شہری آزادیاں' پاکستان کا تصور' مہاجرین' مسلمان خواتین' معاشرتی برائیاں' افسران حکومت' تعلیم و تربیت و کردار سازی وغیرہ) کے تحت قائداعظمؒ کی تقریروں سے اقتباسات اخذ کر کے انھیں مرتب کیا ہے' جو قائد کے ذہن و فکر کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔

قائداعظمؒ کے نظریات خصوصاً ان کے تصور پاکستان کو سمجھنے کے لیے یہ ایک عمدہ انتخاب ہے جسے رضہ'

صاحب نے سلیقے سے مرتب کیا اور فضلی سنز نے خوب صورت اور معیاری انداز میں شائع کیا ہے۔ (ر - ہ)

قیام و دوام پاکستان، پروفیسر مہر محمد نواز خان۔ ناشر: اسلامک بک سروس، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۵۱۵۔ قیمت: ۲۴۵ روپے۔

مذکورہ کتاب ایم اے تاریخ و سیاسیات اور مقابلے کے امتحانوں میں حصہ لینے والے طلبہ کی رہنمائی کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ تحریک خلافت سے ریڈ کلف ایوارڈ تک برعظیم میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات، پھر تخلیق پاکستان سے موجودہ دور تک کے حالات اور پھر یہ بحث کہ اپنی عظیم استعداد کے باوجود پاکستان اپنا کردار کیوں نہ ادا کر سکا؟

پروفیسر نواز نے تاریخی حقائق کو دردمندانہ مگر دلچسپ تحریر کی شکل میں مرتب کر دیا ہے، جگہ جگہ غیر ملکی مصنفین کی آرا بھی درج کی ہیں۔ قیام پاکستان کی جدوجہد، دو قومی نظریے کی تعبیر اور پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو جس طرح ہدف تنقید بنایا جاتا ہے یہ اس کا موثر جواب ہے۔ پاکستان کے حوالے سے آخری ابواب میں اگر پاکستان کو لوٹنے والے سیاست کاروں کا تذکرہ بھی ہو جاتا تو کتاب کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی۔ افسوس کہ تاریخ میں غاصبوں، لٹیروں اور عوام کا استحصال کرنے والوں کا تذکرہ خاطر خواہ طریقے سے سامنے نہیں آتا۔ بہرحال یہ مفید کتاب نہ صرف طلبہ، بلکہ عوام الناس کے لیے بھی قابل مطالعہ ہے اور لائبریریوں کی ضرورت ہے۔ (محمد ایوب منیر)

الفرقان، مولانا منظور نعمانی نمبر، مرتبہ: عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ ناشر: ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ۔ صفحات: ۴۷۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

یہ خاص شمارہ "الفرقان" کے بانی مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے لیے خراج عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں مرحوم کے علمی و دینی کارناموں کو اجاگر کرنے والے طویل اور مختصر، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین، تاثرات، منظومات اور خطوط کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ مرحوم کی خدمات کا دائرہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ چنانچہ اس نمبر میں برعظیم میں اس پورے دور میں دین اور شریعت کے احیا و نفاذ کے لیے کی جانے والی کاوشوں کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے۔

آخری حصے میں مولانا نعمانی مرحوم کے لائق فرزند جناب عتیق الرحمٰن سنبھلی نے مختصر سوانح مرتب کی ہے جس میں جماعت اسلامی میں مرحوم کی شمولیت اور پھر علیحدگی کا بھی ذکر ہے (یہ ذکر اسی شمارے کے متعدد دیگر مضامین میں بھی ملتا ہے)۔ بار بار بتایا گیا ہے کہ مولانا نعمانی مرحوم ایک "غلط جگہ" چلے گئے تھے اور

"آپ کی زندگی کے چند قیمتی سال ضائع ہو گئے" (ص ۲۵۹)۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی مرحوم (بانی تبلیغی جماعت) کے روحانی تصرف سے وہ راہ راست پر آ گئے اور اسے "ایک تقدیری امر کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا"۔ لیکن "جملہ معترضہ" کے تحت سنبھلی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اور مولانا مودودی کی تحریروں اور علی گڑھ میں ان کے لیکچر "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" (۱۹۴۰) اور ان کے پروگرام کو جس طرح غیر عملی اور ہوائی نقشہ کار قرار دیا ہے، اسے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہاں ایک بے محل بحث چھیڑنے کی کوشش کی ہے، جسے خاص نمبر کے موضوع سے مناسبت نہیں۔ (ر - ہ)

کتاب النباتات، حکیم منیر احمد قریشی۔ ناشر: ادارہ مطبوعات سلیمانی، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۵۲۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔

مصنف نے محض اپنے شوق اور لگن سے پاکستان کے مختلف علاقوں کے اہم ادویاتی پودوں پر اپنی تحقیق کو زیر نظر کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک انتہائی مفید اور بیش قیمت کتاب ہے جس میں پودوں کے سائنسی و مقامی نام، ان کی شناخت، مقام پیدائش، ان کی تاریخ، کیمیاوی تجزیہ، افعال و خواص، خوراک اور فوائد وغیرہ مع رنگین تصاویر شامل ہیں۔ مصنف نے خود جنگلوں، ویرانوں اور پہاڑوں میں گھوم پھر کر معلومات جمع کی ہیں اور تصاویر کی فراہمی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ہر تصویر کے ساتھ تاریخ، مقام اور اس کی بلندی بھی لکھ دی ہے۔ ابتدا میں علم نباتات کی تاریخ دی ہے اور بعض ماہرین نباتات کے کارناموں پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے۔ پاکستان میں طبی نقطہ نظر سے پودوں کی تحقیق پر کئی سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں، زیر نظر کام ایک فرد واحد کی محنت و کاوش کا حاصل ہے، اس لیے یہ ہر طور قابل ستایش ہے۔ نباتات کے بعض ماہرین نے بھی اس کاوش کو سراہا ہے۔ کتاب رنگین تصویروں کے ساتھ اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ (ر - ہ)

ملک لوٹنے والے چہرے، افضال مظہر راٹھور۔ ناشر: نوری بک ڈپو، امین بازار، فیصل آباد۔ صفحات: ۳۲۰۔ قیمت: ۱۷۰ روپے۔

وطن عزیز وجود میں آیا تو چند سال بعد ہی حکمرانوں کی غفلت اور بعض اوقات ان کی ملی بھگت سے یہاں کرپشن شروع ہو گئی اور طرح طرح کی بدعنوانیاں سامنے آنے لگیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور اہل وطن کی مزید بدقسمتی یہ کہ اس کرپشن کے خلاف کہیں سے موثر آواز بلند نہ ہو سکی (شاید اس لیے کہ برسر اقتدار سیاست دان اور ارباب بست و کشاد

اس میں پیش پیش تھے)۔ البتہ جماعت اسلامی نے اس ناسور کے خلاف شدید احتجاج کیا چنانچہ گذشتہ چند سالوں میں ملک کے پڑھے لکھے متوسط طبقے میں بیداری کی ایک لہر اٹھی ہے اور کچھ لوگوں نے ناقابل تردید حقائق کو کتابی شکل دے کر بدعنوان افراد کو عوامی کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب کے مصنف پیشے کے لحاظ سے بنک کار ہیں۔ حقائق اور اعداد و شمار کو جمع کرنے کے لیے انھوں نے اخبارات و رسائل اور اس موضوع پر لکھی جانے والی بعض دیگر کتب سے استفادہ کیا (کئی دیگر مستند مآخذ سے بھی استفادہ نہ صرف ممکن تھا بلکہ وقت کی ضرورت بھی تھی)۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ملک لوٹنے والے ارب پتی اور کروڑ پتی افراد نے کتنا ٹیکس دیا۔ مختلف مارکیٹوں سے کتنا ٹیکس وصول ہوتا ہے۔ کن لوگوں نے قرضے معاف کرائے ہیں۔ قومی و صوبائی اسمبلی کے کن ممبران نے اپنے اور اقربا کے علاج معالجے کے لیے سرکاری خزانے سے کتنے کروڑ وصول کیے۔ اسلام آباد، لاہور، کراچی اور دیگر شہروں میں پلاٹ کیسے تقسیم ہوتے رہے اور کیسے کیسے پارسا اس سے "مستفیض" ہوئے۔ مختلف ہیراجوں سے کن لوگوں کو زمینیں الاٹ کی گئیں۔ سیکرٹ فنڈ سے کون کون سیاسی افراد فائدہ اٹھاتے رہے۔ مصنف نے حکمرانوں کی باہمی رشتے داریوں کی تفصیلات بھی مرتب کی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب معلومات کا ایک خزینہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرپشن اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مصنف کی یہ بات درست ہے کہ ناکام اور بوسیدہ سیاسی طریقہ کار، پیچیدہ عدالتی نظام، کوٹہ سسٹم، میرٹ سے انحراف اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر بھی کرپشن کو پھیلنے میں مدد ملی ہے۔ پھر یہ کہ اب تک کسی نے کسی کا احتساب نہیں کیا۔ مصنف نے ایسی تجاویز بھی دی ہیں، جن پر عمل کر کے اقتصادی حالت کو سنوارا جا سکتا ہے۔

کتاب کو تحقیقی اصولوں کے تحت زیادہ بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ چھپائی اور گٹ اپ میں بہتری کی خاصی گنجایش موجود ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب کرپشن مافیا کو سمجھنے میں مددگار ہے۔ (عبداللہ شاہ ہاشمی)

مطبوعات موصولہ

☆ **آؤ، قرآن کی طرف**، ریاض احمد۔ ناشر: مدینہ سٹیشنری اینڈ بک سنٹر، کاغان روڈ، بالاکوٹ، ضلع مانسہرہ۔ صفحات: ۴۸۔ قیمت: ۲۰ روپے۔ ["قرآن سے دوری کو بدلنے" کا قابل قدر اور دردمندانہ جذبہ اس تحریر کا محرک بنا۔ فہم قرآن کی اہمیت، ضرورت، شرائط، تقاضے اور فہم قرآن میں معاون اداروں کا تعارف]۔

☆ **احادیث قدسیہ**، ترجمہ: ابو مسعود ندوی۔ ناشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۱۳۴۔ قیمت: ۳۵ روپے۔ (علما کی ایک مجلس کا انتخاب حدیث، جسے مع حوالوں کے، مختلف عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے)۔

ہمدرد کی جوشینا

تیار جوشاندہ

نئے میٹلائزڈ ساشے میں نباتاتی اجزاء اور روغنیات کے شفابخش قدرتی خواص مکمل طور پر محفوظ

زیادہ پُرتاثیر، زیادہ پُرافادیت



نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش کے علاج کے لیے قدرت کے شفاخانے میں جوشاندے کے نباتاتی اجزاء کی افادیت صدیوں سے مسلّم ہے۔ تحقیق و تجربات کی روشنی میں جدید طریقے سے حاصل کردہ جوشاندے کا خلاصہ "جوشینا" نہ صرف نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور ان کے باعث ہونے والے بخار کا تدارک کرتی ہے بلکہ ان تکالیف کے خلاف قوتِ مدافعت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

گھر ہو یا دفتر نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش سے نجات کے لیے ہمدرد کی جوشینا کا ایک ساشے گرم پانی کے ایک کپ میں حل کیجیے: جوشاندے کی ایک مؤثر خوراک تیار ہے۔ نہ جوشاندہ اُبالنے کی زحمت، نہ چھاننے کا تردّد۔

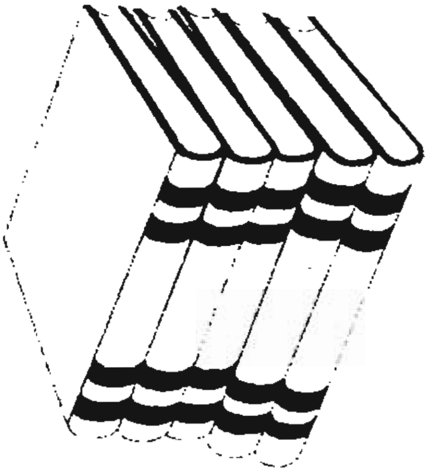
نزلہ زکام — جوشینا سے آرام

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HMD/ل/J-1/95

خواتین کے لیے نادر تحفہ



"خوبصورت جہیز سیٹ"

پردہ ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عصرِ حاضر میں اس موضوع پر لکھی جانے والی سب سے ممتاز کتاب جسے عالمِ اسلام میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کم کتابوں کے نصیب میں آتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اب تک اس کے کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بِک چکے ہیں۔

آسان فقہ ۔ محمد یوسف اصلاحی (حصہ اول، حصہ دوم)

باہمی اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس کتاب میں صرف وہی متفقہ عملی مسائل اور کتاب و سنت کی روح و منشا کے مطابق ان کے حل پیش کیے گئے ہیں جو عام زندگی میں پیش آتے ہیں۔

آدابِ زندگی ۔ محمد یوسف اصلاحی

اپنی زندگیوں کو اسلامی آداب سے سجانے اور سنوارنے کی آرزو رکھنے والوں کیلئے نادر تحفہ

راہِ عمل ۔ مولانا جلیل احسن ندوی

ہادیٔ اعظم نبی اکرم ﷺ کے مبارک اقوال و افعال کی روشنی میں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ڈھالنے کے لیے رہنما کتاب۔

حسنِ معاشرت اور اس کی تکمیل میں خواتین کا حصہ۔ محمد یوسف اصلاحی

ان خواتین کے لیے جو اپنے فرائض کے گہرے احساس، پرسوز جذبات اور مجاہدانہ کوششوں سے اس خاکے میں رنگ بھر سکتی ہیں۔

قیمت مکمل سیٹ 800/- روپے　　رعایتی قیمت 500/- روپے

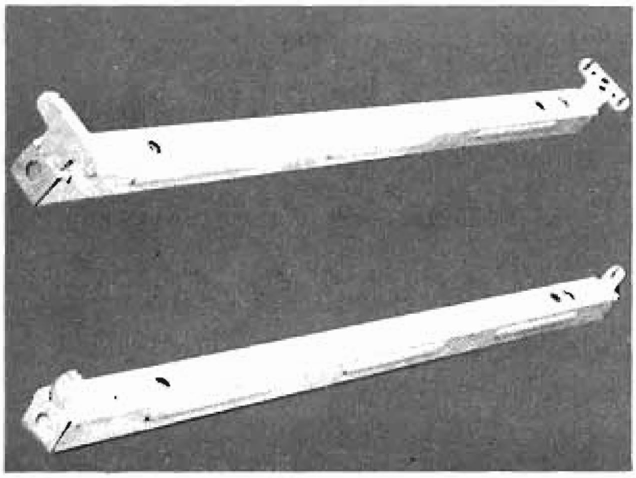
اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

13-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور فون: 7669546- 7664504 فیکس: 7658674-

شوروم: 10- چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

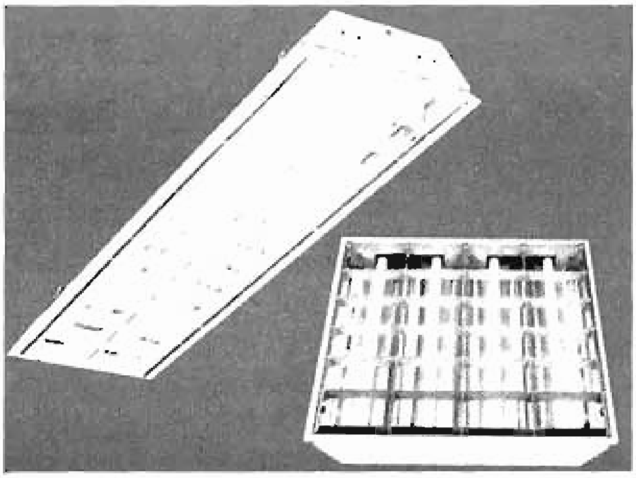
حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

BATTEN LIGHT



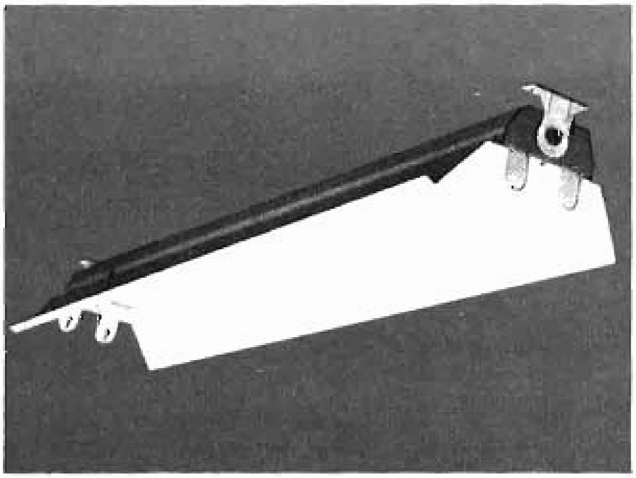
Beautiful slim shape covered ballast tube light fixture for bed rooms, T.V. lounge & drawing rooms etc.

OFFICE LIGHT



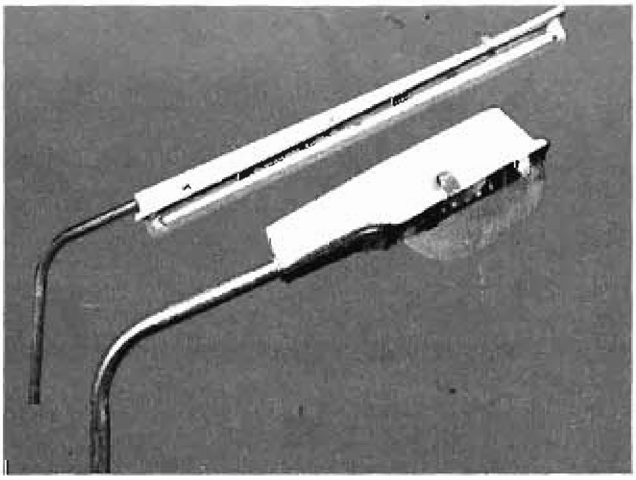
2x2 and 1x4 Recessed and surface fixture with beautiful aluminium louver for maximum and glare free lighting

INDUSTRIAL LIGHT



Tough fixture with reflector for effective lighting and round the clock operation.

STREET/ROAD LIGHT



Most widely used for streets and roads lighting. Weather resistant and water proof fixtures.

PAKLITE

TUBE LIGHT FITTINGS

PAKLITE ELECTRICAL INDUSTRIES (PVT) LTD.

Sheikhupura Road, Gujranwala, Pakistan. Ph: 0431-272890-93 Fax: 0431-272894

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,